باتوں سے باتیں

پروفیسر میاں مقبول احمد

ایم اے اُردو، فارسی، بی ایڈ، ایل ایل بی

سابق پرنسپل گورنمنٹ کالج شاہدرہ (لاہور)

Marfat.com

باقی سب باتیں

Marfat.com

NO. SO.E&A (INF) 10-1/2000

GOVERNMENT OF THE PUNJAB
INFORMATION CULTURE & YOUTH
AFFAIRS DEPARTMENT

Dated Lahore the January 26, 2007

To,

The M/s Maula Shah Welfare Society,
Gujranwala.

Subject: - BEST PUBLISHER AWARD FOR THE YEAR 2002, 2003 & 2004

Dear Sir,

I have the honour to intimate that the panel of judges nominated by Government of Punjab, Information, Culture & Youth Affairs Department has recommended yours book titled "Mirza Sahiban" published in the year 2004 for first prize. Kindly accept my congratulations.

2. Cheque bering No. CA-25/APN-P-862654 dated 15.1.2007 of National Bank of Pakistan, Civil Secritariat, Lahore amounting to Rs. 50,000/- is enclosed as prize money for yours books.

3. Kindly acknowledge receipt.

Sajeela Naveed

(SAJEELA NAVEED)
DEPUTY SECRETARY (ADMI
IC & YA DEPTT.

Marfat.com

باتیں سچی باتیں

(انشائیے)

پروفیسر میاں مقبول احمد

ایم۔اے (اردو، فارسی)، بی ایڈ، ایل ایل۔بی

سابق پرنسپل گورنمنٹ کالج شاہدرہ، لاہور

بزمِ مولا شاہ (سائیں مولا شاہ ویلفیئر سوسائٹی)

(حکومتِ پنجاب سے 2004 کا بیسٹ پبلشر ایوارڈ یافتہ ادارہ)

Marfat.com

111248

808.87 MAQBOOL AHMAD , PROF. MIAN
M69B

BAAT SE BAATAIN , LAHORE,
BAZM-E-MAULA SHAH, 2008.

208 p

1. TITLE
2. TANZ-O-MZAH

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

پریس ..... میاں سعید روشن پرنٹرز، 43 ریٹی گن روڈ لاہور

ناشر ..... بزم مولا شاہ

41-A چوہان روڈ، اسلام پورہ لاہور

قیمت ..... -/[redacted] روپے

ایہ کتاب حکومتِ پنجاب کے شعبہ امورِ نوجوانان، ثقافت اور اطلاعات کے تعاون سے شائع ہوئی۔

ISBN: 978-969-8082-25-0

Marfat.com

تقدیم

پیاری امّی جان کے نام

جن کے قدموں تلے میری جنّت ہے

اور

پیارے ابّو جان کے نام

جنہوں نے

مجھے زندگی کی بنیادی ضرورتیں اور سہولتیں فراہم کیں،

میری تعلیم و تربیّت فرمائی اور روزی کمانے کے قابل بنایا۔

Marfat.com

Marfat.com

فہرست

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
1.	بات (ایک تبرک)	7
2.	ایک بات (تقریظ)	9
3.	پہلی بات (پیش لفظ)	11
	آ	
4.	آنکھ اور آنکھیں	13
5.	آہ اور واہ	16
	ا	
6.	اخلاق اور کردار	18
7.	اصل اور نقل	20
8.	"ا" سے ایک	22
9.	امید اور ناامیدی	25
	ب	
10.	بات	28
11.	بلا اور وبا	34
12.	بولنا اور لکھنا	36
13.	بے حیائی اور بے غیرتی	38
	پ	
14.	پتنگ اور پتنگا	40
15.	پنجر اور پنجرہ	42
16.	پیار اور بیوپار	44
	ت	
17.	تخت اور تاج	47
18.	تدبیر اور تقدیر	51
19.	تہمت اور بہتان	53
20.	تیزی اور تُندی/تلخی و تُرشی	55
	ث	
21.	ثواب اور عذاب	57
	ج	
22.	جبر اور صبر	59
23.	جدائی اور موت	62
24.	جمہور اور جمہوریت	65
25.	جھڑکی اور دھمکی	68
26.	جھوٹ اور سچ	70
	چ	
27.	چالاکی اور چاپلوسی	76
28.	چلتے چلتے	80
29.	چور اور خور	83
30.	چھری اور چاقو	87
31.	چھوٹا اور بڑا	90
	ح	
32.	حیرت اور حسرت	93
	خ	
33.	خاک اور خاکہ	95
34.	خراش اور خلش	98
35.	خواب اور خیال	100
36.	خوب تر اور بدتر	103

Marfat.com

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
37.	خوشی اور غم	107
38.	خوف اور خطرہ	110
	د	
39.	"د" سے دل	114
40.	"د" سے دو	117
41.	دعا اور دوا	120
42.	دکھ اور درد	122
43.	دکھ اور سکھ	124
44.	دل اور دماغ	127
45.	دوستہ اور دشمنی	130
46.	دہن اور ذہن	134
47.	دھرم اور دھڑا	136
48.	دھمکی اور دھماکا	140
49.	دھوکا اور فریب	142
50.	دھونس اور دھاندلی	145
51.	دید اور شنید/ دیدہ اور شنیدہ	147
	ڈ	
52.	ڈار اور ڈر	149
53.	ڈر اور ڈراما	152
54.	ڈیل اور ڈھیل	155
	ر	
55.	راج اور رواج	157
56.	راز اور نیاز	161
57.	رت اور روپ	164
58.	رستہ اور رشتہ	166
59.	رونا اور ہنسنا	172
	س	
60.	سوال اور جواب	174
	ش	
61.	شراب اور شباب	177
62.	شیرینی اور شیریں	181
	ض	
63.	ضرورت اور ایجاد	184
	ط	
64.	طاقت اور قوت	187
	غ	
65.	غلطی اور توبہ	191
	ف	
66.	فیشن اور سادگی	194
	ق	
67.	قِسم اور قَسم	196
	ک	
68.	کھیل اور کھلونا	198
69.	اپنی بات	203
70.	بزم کی کتابیں	206

Marfat.com

بات

(تبرک)

بات سے بات کو ٹالنا ہے ستم ، بات سن لو ہماری تو کیا بات ہے
دیکھنا بات کو کاٹنا چھوڑ دو ، بات سن لو گے ساری تو کیا بات ہے
بات اپنے بنانے سے بنتی نہیں ، بات پر بات کوئی بھی پھبتی نہیں
بات کو نہ چھپاؤ کسی بات میں ، بات ہے مگر تمہاری تو کیا بات ہے
بات کو چھوڑ دینا بھی کیا بات ہے بات قسمت بھی ہے بات بارات ہے
بات باتوں میں مل کر کبھی نہ بنی ، بات میں شب گزاری تو کیا بات ہے
بات میں آ گئے بات جاتی رہی ، بات باتوں میں آ کر ستاتی رہی
بات بگڑی اگر بات کے دور میں ، بات گر نہ سنواری تو کیا بات ہے
بات باتوں میں آ کر جو بڑھتی گئی ، بات پھر نہ بنی بات جاتی رہی
بات پیچھے بھی ہے بات آگے بھی ہے، بات سے بات ہاری تو کیا بات ہے

Marfat.com

بات کو بھی بھگانا بڑی بات ہے ، بات سے جی چرانا بُری بات ہے
بات سے داستان نہ ختم ہوسکی ، بات پر بات ماری تو کیا بات ہے
بات کا جو بتنگر کھڑا ہوگیا ، بات نے بات کو نہ اکٹھا کیا
بات آگے چلی بات ہی بات میں ، بات نے گر بگاڑی تو کیا بات ہے
بات اٹکی رہے بات چلتی رہے ، بات کی بات دل میں کھٹکتی رہے
بات کے بھی نظارے کیا خوب ہیں ، بات ہے تیز آری تو کیا بات ہے
بات کو طول دینا بھی کیا بات ہے ، بات کی بات سوچو کیا ذات ہے
بات میٹھی بھی ، پھیکی بھی ، کڑوی بھی ہے ، ہاں اگر ہے یہ کھاری تو کیا بات ہے
بات نفرت بھی ہے بات ہے دل نشیں ، بات کی دل میں کوئی جگہ بھی نہیں
بات نے بات کا سر قلم کر دیا ، بات کی ہے مکاری تو کیا بات ہے
بات آغاز ہے بات انجام ہے ، بات ہے کام کی بات ناکام ہے
بات ہے بدزباں بات سوز و زیاں ، بات میں ہے عیاری تو کیا بات ہے
بات ایسی بھی ہے بات ویسی بھی ہے ، بات جیسی بھی ہے بات کیسی بھی ہے
بات کھوٹی کھری ہے پر جیسی بھی ہے گھر کی ہے بازاری تو کیا بات ہے
بات ادنیٰ بھی ہے بات اعلیٰ بھی ہے ، بات کا روپ سب سے نرالا بھی ہے
بات کو میں نے منظرؔ ختم کر دیا ، ہاں اگر پھر ہے جاری تو کیا بات ہے

ڈاکٹر میاں محمد اسماعیل منظرؔ

Marfat.com

ایک بات

کتاب پر ایک سرسری نگاہ ڈالنے سے یہی دکھائی دیتا ہے کہ لفظوں سے کھیلنا مصنف کا مشغلہ ہے۔ وہ لفظوں کی گیند لے کر میدان میں اترتا ہے اور قلم کی سٹک سے گیند کو ہلکی ہلکی ضربیں لگا کر اور ادھر ادھر گھما پھرا کر داؤ پیچ لگانے کی پریکٹس کرتا ہے پھر دوسرے (قاری) کو ساتھ ملا لیتا ہے اور دونوں لفظوں کے کھیل میں مشغول و محو ہو جاتے ہیں۔

کھیل سے جب مصنف کی طبیعت سیر ہو جاتی ہے تو ایک کارآمد سٹروک لگا کر خود ہی ریفری بن کر کھیل کے خاتمے کی سیٹی بجا دیتا ہے۔ قاری پہلے تو اس کے اچانک فیصلے پر سوچ میں پڑ جاتا ہے پھر جلد ہی اس کے مقصد کو پا لیتا ہے اور اس سے متفق ہو جاتا ہے اور اسے اس تفریحی کھیل کا کامیاب کھلاڑی قرار دیتا ہے۔

لفظوں کے بجائے اگر بات کو دیکھا جائے تو مصنف بات سے بات پیدا کرنے اور نکالنے کا ڈھنگ خوب جانتا ہے۔ باتیں بنانے اور باتیں گھڑنے کا دھنی دکھائی دیتا ہے۔ بس اس کی یہی ایک بات مجھے پسند ہے کہ وہ بات کو بڑھا پھیلا کر جلد سمیٹ لیتا ہے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں اور جملوں میں وہ بڑی بڑی باتیں کہہ جاتا ہے اور اپنے ایسے منفرد انداز میں کہتا ہے کہ جس کی تان اچھی اچھی باتیں کہتے کہتے ہمیشہ کام کی بات کہنے پر ٹوٹتی ہے۔

''غلطی اور توبہ'' میں دونوں کی تعریف و تخصیص کے بعد ان کے فرق کو یوں واضح کرتے ہیں:

''غلطی اور توبہ میں واضح فرق یہ ہے کہ غلطی ہو جاتی ہے اور توبہ کی جاتی ہے۔ غلطی میں بھول تو ہوتی ہی ہے مگر توبہ کو بھول جانا بہت بڑی غلطی ہے اور توبہ شکنی سب سے بڑھ کر غلطی ہے۔''

Marfat.com

پھر غلطی کو جن وانس اور ملائکہ کی جبلّت قرار دیتے ہوئے ابلیس وآدمؑ سے اس کی ابتداء اور ابدالآباد تک اس کے تسلسل کا ذکر کرنے کے بعد اصلاح احوال کی خاطر رقمطراز ہیں:

''اصلاح احوال کی خاطر اگر دفتری، کاروباری یا معاشرتی زندگی میں کسی سے کوئی غلطی سرزد ہو جائے تو اس کا فوری طور پر ازالہ کر لینا چاہیئے اور ازالہ کی ایک ہی آسان صورت ہے کہ اپنی غلطی کو تسلیم کرتے ہوئے معذرت کر لینی چاہیئے اور اگر خدائی اوامر و نواہی کے سلسلے میں کوئی بھول ہو جائے یا کوتاہی رہ جائے تو درِ توبہ پر دستک دینی چاہیئے اور ہمیشہ دعا مانگتے رہنا چاہیئے کہ ذاتِ باری تعالیٰ ہم سب کی سہو وخطا سے درگزر فرمائے اور ہمیں جرم وگناہ سے بچنے کی توفیق عطا فرمائے۔''

آخری بات یہ کہ چونکہ مصنف بنیادی طور پر ایک معلّم ہے اس لئے اس کی باتوں میں علمی ادبی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے اور بکمال سادگی دین واخلاق کا درس عمل بھی ملتا ہے۔ نصیحت گری کا یہ پہلو کچھ اتنا نمایاں ہے کہ اسے مصنف کا مقصد وحید قرار دیا جا سکتا ہے۔ مختصراً ان کی مثالوں اور محاوروں بھری عبارت میں روانی بھی ہے اور سادگی بھی، مزاح بھی ہے اور طنز بھی، شگفتگی بھی ہے اور متانت بھی۔

ان کی باتوں کو پڑھ کر بڑے بوڑھے قارئین کو بھولی بسری باتیں یاد آ جاتی ہیں اور طالب علموں کیلئے تو یہ معلومات کا ایسا خزانہ ہے جس سے انہیں مستفید ہونے کا زیادہ موقع اور مواد ملتا ہے۔

راجا رشید محمود
ایڈیٹر
ماہنامہ ''نعت'' لاہور

Marfat.com

پہلی بات

جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ انشائیہ انگریزی کے Light Essay کے ذریعے سے اردو میں درآمد کیا گیا ہے۔ یہ ہلکا پھلکا مضمون کہلاتا ہے جو ہلکے پھلکے الفاظ اور انداز میں کہا جاتا ہے۔ بوجھل اور ثقیل الفاظ کے ساتھ ساتھ یہ بے جا طوالت کا بھی متحمل نہیں ہوتا بلکہ اختصار ہی اس کی پہچان، شان اور آن ہے۔

میرے نزدیک انشائیہ ایک خیالی کھیل ہے جو لفظوں سے کھیلا جاتا ہے۔ انشائیہ نگار لفظوں کے مہروں کو بساطِ قرطاس پر بڑی مہارت سے چلا کر جلد از جلد بساط سمیٹنے کی کوشش کرتا ہے۔ انشائیہ الفاظ کے ساتھ ساتھ باتوں کا بھی مجموعہ ہوتا ہے۔ یہ الفاظ کے ہیر پھیر اور باتوں کی بھرمار سے اپنی تکمیل کو پہنچتا ہے۔

بات کو اوڑھنا بچھونا بنا کر سن 1989ء میں ''باتوں باتوں میں'' اور سن 1990ء میں ''باتوں میں باتیں'' کے دو مجموعوں میں بہت سی باتیں یکجا کیں۔ یوں باتیں کہتے کہتے اور لکھتے لکھتے باتوں کا ایک ایسا لامتناہی سلسلہ چل پڑا جس سے دماغ نے خوب جِلا پائی اور قلم نے ایسے زور کی روانی پکڑی کہ ''بات سے باتیں'' بنتی اور نکلتی رہیں اور اس کے ساتھ ہی ساتھ ''بات اور باتیں'' کے علاوہ ''باتیں ہی باتیں'' اکٹھی ہوتی رہیں۔ یوں جمع شدہ باتوں کو انہی ناموں سے حروفِ تہجی کی ترتیب سے تین حصوں میں تقسیم کر کے بغرضِ اشاعت محفوظ کر لیا ہے۔ جوں جوں توفیق ہوگی توں توں یہ اشاعت پذیر ہوتی رہیں گی۔

''باتوں باتوں میں'' اور باتوں میں باتیں'' کے اکثر مضامین پشاور کا مشہور روزنامہ ''آج'' ''باتوں باتوں میں'' کے عنوان پر میرا مستقل کالم شائع کرتا رہا ہے اور لاہور سے

Marfat.com

شائع ہونے والے ''پوسٹ مارٹم'' اور ''بھلیکھا'' میں پنجابی ترجمہ کے ساتھ چھپتے رہے ہیں۔ ان کی اخباری اشاعت میرے لئے ایک اعزاز کی بات ہے اور میں اس مارکوان کی مقبولیت کی سند سمجھتا ہوں۔

باتوں کے اس مجموعے کے نام کے لئے کئی باتیں سامنے آئیں۔ مثلاً

بات بات میں
بات سے بات
بات سے باتیں
بات کی بات
بات کی باتیں اور
باتیں ہی باتیں مگر

یہ سمجھ کر کہ بات آخر بات ہی تو ہے کوئی بھی نام رکھ لیا جائے بات بنی ہی رہے گی۔ اس مجموعے کے تمام مضامین میں حسبِ سابق بات سے ہی باتیں بنی اور چلی ہیں لہٰذا نظرِ انتخاب ''بات سے باتیں'' پر مرکوز ہو کر رہ گئی ہے۔

اگر دیکھا جائے تو نام میں دھرا ہی کیا ہے؟ اصل چیز تو کام ہے کیونکہ کام ہی سے نام ہوتا ہے۔

''بات سے باتیں'' ایک دوسرے سے ملتے جلتے (ہم معنی) یا ایک دوسرے کے متضاد الفاظ و مفاہیم کے حامل عنوانات پر مبنی باتوں کا مجموعہ ہے۔ جس میں حروف تہجی کی مناسبت اور ترتیب کے لحاظ سے عنوانات قائم کر کے باتیں جمع کی گئی ہیں اور اب دیکھنا یہ ہے کہ میرا یہ تیسرا مجموعہ بھی میرا اہم نام ثابت ہوتا ہے کہ نہیں؟

میاں مقبول احمد

Marfat.com

آنکھ اور آنکھیں

آنکھ ہندی الاصل ہے اور دیکھنے کا لاجواب آلہ ہے۔ چشم، نین، نگاہ اور نظر اس کے ہم معنی الفاظ ہیں۔ بصارت، توقع اور محبت کے بھی معنی دیتا ہے۔ گھٹنوں کے گڑھوں اور پودوں کی ان جگہوں کو بھی آنکھ کہتے ہیں جہاں سے نئی شاخیں پھوٹتی ہیں۔ مجازاً بیٹے یا بیٹی کا مفہوم بھی لیا جاتا ہے۔

آنکھ قدرت کا وہ انمول تحفہ ہے جس سے جہان آباد ہے اسی لئے تو کہا گیا ہے کہ آنکھ ہے تو جہان ہے آنکھ گئی تو جہان گیا۔ آپ نے اکثر بصارت سے محروم لوگوں کو یہ آواز لگاتے سنا ہوگا کہ " اکھاں والیو! اکھاں بڑی نیامت جے " جس سے آنکھ کے نعمت ہونے کا احساس ہی تو ہوتا ہے۔ مگر ہمیں کبھی یہ احساس نہیں ہوتا کہ ہماری آنکھیں کیا دیکھتی ہیں اور کیا کرتی ہیں؟ انہیں کیا دیکھنا چاہئے اور کیا کرنا چاہئے؟ اس بارے ہم نے کبھی سوچا ہی نہیں کہ آنکھیں کھول کر سمجھیں کہ ان کا مقصد کیا ہے؟ کیا ہم جس طرح انہیں استعمال کرتے ہیں یہی ان کا حق ہے یا ہمیں ان کے استعمال کے لئے کسی قاعدے قانون کی پابندی کرنا چاہئے؟ طبی اصولوں کے مطابق ان کی حفاظت لازم ہے اور اسلامی اصولوں کے مطابق انہیں استعمال کرنے کے لئے ہمارے پاس ایک باقاعدہ دستورالعمل ہے جس کی پابندی سے ہم دنیا اور آخرت یعنی دونوں جہانوں کی فوز و فلاح سے فیض یاب ہوتے ہیں۔ مگر افسوس کہ ہم جب آنکھیں کھولتے ہیں تو ہمیں اپنے اردگرد صرف دنیا کی رنگارنگی رونق اور چاشنی ہی نظر آتی ہے۔ دنیا کے ٹھاٹھ باٹھ اور اس کی گہما گہمی ہماری آنکھوں کو اصل حقیقت کی جانب متوجہ ہی نہیں ہونے دیتی۔ دنیا کی دولت پانے کے لئے ہم اتنے اندھے ہو جاتے ہیں کہ دوسروں پر سبقت لے جانے کیلئے نہ ہمیں اپنا آپ نظر آتا ہے اور نہ وہ فرائض ہی دکھائی دیتے ہیں جو دوسروں کیلئے ہم پر عائد ہوتے ہیں۔ ہم دوسروں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے ان کی آنکھوں پر پردہ ڈالنے اور ان کے عیبوں کو اجاگر کرنے کی فکر میں محو رہتے

Marfat.com

ہیں مگر اپنی آنکھوں پر پردہ کرنے کو بالکل معیوب سمجھتے ہیں حالانکہ قانون شریعت میں دوسروں کے عیبوں پر پردہ ڈالنے اور آنکھوں کو بند رکھنے کی تاکید کی گئی ہے۔ دوسروں کو تو ہم آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر تکتے ہیں مگر اپنی جانب کبھی بھولے سے بھی نہیں دیکھتے کہ کچھ اپنی پہچان بھی ہو سکے۔

ہم یونہی آنکھیں مٹکائے پھرتے ہیں، یونہی آنکھیں لائے پھرتے ہیں، یونہی دوسروں کے لئے بچھائے پھرتے ہیں، یونہی دوسروں سے آنکھیں ٹکرائے پھرتے ہیں، یونہی دوسروں سے آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارے اور باتیں کرتے پھرتے ہیں مگر افسوس کہ ہم کبھی اپنے دل کی آنکھوں کو نہیں کھولتے اور نہ انکی حفاظت اور انکے جائز استعمال کی طرف دھیان دیتے ہیں۔ دھوپ، اندھیرے، گرد وغبار اور تیز روشنی سے انہیں نہیں بچاتے۔ الیکٹرانک میڈیا کو دیکھ دیکھ کر انکا ستیاناس کر لیتے ہیں غرض رات دن ہم انکو اس بے دردی اور لاپروائی سے استعمال کرتے ہیں کہ وہ دکھنے لگتی ہیں ان سے آنسو بہنے لگتے ہیں اور انکے آگے اندھیرا چھانے لگتا ہے۔ حالانکہ سائنس کی جدید تحقیق کے مطابق کہ "بے جا اور بے احتیاطی سے آنکھوں کا استعمال کرنے والوں کو بڑھاپے میں اندھے ہو جانے کا خطرہ ہوتا ہے" اپنی آنکھوں کی حفاظت کی فکر نہیں کرتے۔ مزید برآں یہ بھی تحقیق ہو چکی ہے کہ ٹی وی اور کمپیوٹر دیکھنے والوں کی آنکھیں جلد خراب ہو جاتی ہیں مگر اس کے باوجود ہم اور ہماری آنکھیں اتنی فارورڈ ہو چکی ہیں کہ ہم نقل کو اصل پر اہمیت دے رہے ہیں۔

دانشور آنکھ کا مرتبہ ومقام متعین کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ

1: آنکھ جب آنکھ سے دیکھتی ہے تو سمندر سے موتی نکال لیتی ہے۔
2: آنکھ جب کھلتی ہے تو کائنات کے رازوں کے پردے کھول دیتی ہے۔
3: آنکھ جب روتی ہے تو عرش ہلا کر رکھ دیتی ہے۔
4: آنکھ جب جھکتی ہے تو زمانے بھر کی حیا اپنے اندر سما لیتی ہے۔
5: آنکھ جب مسکراتی ہے تو کائنات کی ساری معصومیت اپنے اندر جذب کر لیتی ہے
6: آنکھ جب چاہتی ہے تو دنیا بھر کو روشنی عطا کر دیتی ہے۔

آنکھوں کی حفاظت کرنا اور ان سے جائز کام لینا ہمارا دینی فریضہ ہے۔ آنکھوں کو کھول کر رکھنا انہیں سامنے رکھنا اور ان سے شرمانا بھی لازم ہے خاص کر ہماری خواتین کیلئے تو اپنی آنکھوں کو چھپا کر رکھنے کی خاص تاکید آئی ہے۔ مگر افسوس کہ ہماری مستورات اس سے بے نیاز ہو کر اپنی

Marfat.com

آنکھوں کو بطور خاص کھلا چھوڑتی ہیں چاہے باقی چہرے پر پردہ کیا ہو حالانکہ اصل شرم وحیا آنکھوں ہی میں ہوتی ہے۔ دُعا ہے کہ خدا ہم سب مردوں اور عورتوں کو طبی اور اسلامی لحاظ سے اپنی آنکھوں کی حفاظت کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ کیونکہ حضرت علیؓ کا فرمان ہے کہ "بھولے سے پڑی پہلی نظر قابل معافی ہے مگر دوسری نظر کی معافی نہیں کیونکہ اس سے گناہ کی ابتدا ہوتی ہے" اور حضرت احمد رضا خان بریلویؒ کے بقول "اپنی آنکھوں کو بھٹکنے سے بچاؤ کیونکہ آنکھوں کے بھٹکنے سے دل بہک جاتا ہے اور دل کا بہکنا نفس کے بھٹکنے کا باعث بنتا ہے اور نفس کے بھٹکنے سے انسان گمراہی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔" بقول شاعر:

نظروں کے اس ہجوم میں لازم ہے احتیاط
سہوِ نظر معاف ہے قصدِ نظر حرام

اس لئے ہمیں اپنی آنکھوں کا خاص طور پر دھیان رکھنا چاہئے تا کہ ان کے غیر شرعی استعمال سے انسان گناہ کے دلدل میں پھنس کر نہ اپنی زندگی ہارے اور نہ اپنی عاقبت خراب کرے۔

المختصر آنکھوں کی حفاظت میں ہی ہماری دنیاوی زندگی کی بہتری اور آخرت کی زندگی کی بھلائی کا راز مضمر ہے اور یہ بھی یاد رہے کہ آنکھیں کاجل کی سیاہی سے خوبصورت نہیں ہو سکتیں بلکہ شرم وحیا کی سرخی سے خوشنما لگتی ہیں۔ یہ بھی یاد رہے کہ آنکھیں اٹھا کر دیکھنا گستاخی اور بے ادبی ہے اور آنکھیں جھکا کر چلنا شرم وحیا کی علامت ہے اور آنکھیں جھکا لینا ادب واحترام کا اظہار ہے۔

Marfat.com

آہ اور واہ

آہ اور واہ فارسی کے ہم وزن اور مونث کلمات ہیں۔آہ بطور کلمہ تاسف اور واہ بطور کلمہ تحسین استعمال ہوتا ہے۔آہ حیف افسوس اور ہائے کے اظہار کے لئے بولا جاتا ہے۔اسے حیرت وتعجب کے طنز وتعریف کے طور پر بھی بولتے ہیں جیسے: واہ رے! واہ واہ (واہ وا) یا واہ کیا بات ہے؟

آہ کوک ہے،فریاد ہے، چیخ ہے، پکار ہے جو دکھ درد اور مصائب ومشکلات کے وقت دل سے اٹھتی ہے اور دودِ دہن کی صورت میں منہ سے نکلتی ہے۔مریض درد کے مارے آہ آہ کرتا ہے، بچے پٹنے پر اور احباب کسی کی موت پر سرد آہیں بھرتے ہیں۔عاشق لوگ ہجر وفراق کے عالم میں گرما گرم آہیں بھرتے ہیں۔مظلوم بے بسی میں آہ بھر کر رہ جاتا ہے مگر یاد رہے کہ جب کوئی مظلوم آہ جگر نکالتا ہے تو اس کی پکار سیدھی عرش معلیٰ کی طرف اٹھ کر پائے عرش کو ہلا دیتی ہے اور بارگاہ خداوندی میں پہنچ کر شرف قبولیت حاصل کر لیتی ہے اور رنگ لائے بغیر نہیں رہتی۔اس کی پرواز اور رسائی بزبان شاعر ملاحظہ ہو

آہ جاتی ہے فلک پہ رحم لانے کے لئے
بادلو ہٹ جاؤ دے دو راہ جانے کے لئے

مگر اس کے مقابلے میں فارسی کا یہ شعر آہ کی رسائی اور قبولیت کے ساتھ ساتھ نصیحت آموز بھی ہے۔

بترس از آہِ مظلوماں کہ ہنگامِ دعا کردن
اجابت از درِ حق بہرِ استقبال می آید

Marfat.com

مگر یہ کہنا اور سمجھنا میرے نزدیک بعید از فہم و یقین ہے کہ

ع آہ کو چاہئے اک عمر اثر ہونے تک

یوں تو ہر آہ اپنا اثر دکھاتی ہے مگر آہ نیم شب چاہے دعا کی صورت میں ہو چاہے بد دعا کی صورت میں فوراً رنگ لے آتی ہے۔

آہ کے مقابل میں واہ میں اگر چہ داد و تحسین اور تعریف و توصیف کا پہلو ہوتا ہے لیکن اس میں پوشیدہ طنز سے چشم پوشی ٹھیک نہیں۔ واہ وا کرنے میں اگر چاپلوسی پنہاں ہو تو وہ قابل نفرت و مذمت ہے اور اگر اس میں طنز کے نشتر چھپے ہوں تو نا قابل برداشت متصور ہوتی ہے مگر واہ واہ سن کر فخر محسوس کرنا سب سے زیادہ قابل افسوس ہے اور اگر کسی کی سچ مچ واہ واہ مچ ہی جائے (یعنی نام کی دھوم ہو جائے) تو اسکو بحال رکھنے کی سعی و کوشش میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھنی چاہئے۔ تاہم ''واہ! کیا بات ہے'' جو مفہوم سمجھ لے کہ اس میں طنز ہے یا توصیف تو واقعی اس کی کیا بات ہے؟ واہ کی ماہیت جاننے کیلئے اس سے منسوب چند ضرب الامثال ملاحظہ کیجئے

"واہ پیر علیا پکائی تھی کھیر بن گیا ذلیا" یہ اس وقت بولتے ہیں جب کوئی کام از خود یا کسی کی بدعا سے خراب ہو جائے۔

"واہ میاں کالے! کیا رنگ نکالے" یہ اس وقت بولتے ہیں جب کسی کا مکر و فریب ظاہر ہو جائے۔

"واہ واہ گرگٹ کا بچہ تا نا شاہ" یہ اس وقت بولتے ہیں جب کوئی ادنیٰ شخص نخرے دکھاتا ہے۔

"واہ واہ میاں بانکے! تیرے گلے میں سوسو ٹانکے" یہ اس شخص کے لئے طنزاً بولتے ہیں جو مفلسی میں بھی چھیلا بننے کی کوشش کرتا ہے۔

المختصر آہ کے ضمن میں میرا مشورہ یہ ہے کہ کسی کو ناحق ستا کر اسکی آہ نہ لیجئے تا کہ اس کے وبال سے آپ محفوظ رہیں اور واہ کے ضمن میں میرا مشورہ یہ ہے کہ نہ بے جا واہ کرنے کی بدنامی مول لیجئے اور نہ بے جا واہ سن کر اپنا دماغ خراب کیجئے۔

Marfat.com

اخلاق اور کردار

اَخلاق خُلق کی جمع ہے اور خلق طبعی خصلت ہے اور کردار طرزِ عمل اور چلن کا نام ہے۔ اخلاق ادب سے تربیت پاتا ہے اور کردار اخلاق سے بنتا سنورتا ہے۔ ان دونوں کے اشتراک سے شخصیت تشکیل پاتی ہے اسلئے انسان کو چاہئے کہ وہ " کردنی خویش آمدنی پیش " کے پیش نظر اچھے اخلاق کی بدولت اپنی کردار سازی کرے اور ایک کردار نگار کے لئے بھی لازم ہے کہ کردار نگاری کیلئے کسی شخصیت کے کردار کے روشن پہلو ہی نمایاں کرے تا کہ اس پر کردار کُشی کا الزام نہ آئے۔

خلق سے مراد خوش مزاجی، ملنساری اور مروّت ہے۔ پسندیدہ عادات اور شریفانہ سلوک ہے اور اخلاقیت ہی معیار اخلاق ہے جس کیلئے اخلاق کی تعلیم بہت ضروری ہے۔ کیونکہ علم الاخلاق علم فلسفہ کہ وہ شاخ ہے جس میں تہذیب نفس تدبیر منزل اور سیاست مدن سے بحث کی جاتی ہے۔ مختصراً یہ علم انسانی اعمال کے طور طریقے بتاتا ہے جو فضائل کے حصول اور رذائل سے بچاؤ کے کام آتا ہے جس کے لئے خلق محمدی ﷺ ضرب المثل ہے۔

اخلاق کی دو قسمیں ہیں 1۔ اخلاق حمیدہ 2۔ اخلاق رذیلہ

یعنی اچھے اور برے اخلاق۔ انسان کو معاشرتی حیوان کہا گیا ہے وہ اجتماعیت پسند ہے جو معاشرہ میں بنیادی اہمیت رکھتا ہے اور معاشرہ افراد کی اجتماعی صورت کا نام ہے اس لئے افراد اور معاشرہ لازم و ملزوم ہیں۔ معاشرتی ماحول افراد کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر اثر انداز ہوتا ہے اور افراد کے اخلاقی معیار پر معاشرے کی تعمیر ہوتی ہے۔

اسلام ایک مکمل ضابطہ ء حیات ہے اور اس کا نظریہ اخلاق دین سے جدا نہیں۔ تخلیقِ کائنات کا ایک مقصد ہے اور انسان کائنات میں خدا کا نائب ہے۔ دنیا عمل کا گھر ہے اور اعمال کا انحصار اخلاق پر ہے۔ دل نیکی اور بدی کی کسوٹی ہے۔ نیکی حسن اخلاق کا نام ہے اور گناہ وہ ہے جو جی میں کھٹکے اور دل اسے ناپسند کرے۔ نیک و بد اعمال ہی جزاء و سزا کی بنیاد ہیں جس کے

Marfat.com

لئے دوسرا جہان ہے اس لئے بحیثیت نائب خدا انسان پر لازم ہے کہ وہ دنیا کی تمام چیزوں کو احکام الٰہی کے مطابق استعمال کرے۔ نیکی کو اختیار کرے اور بدی سے بچے۔ حق وصداقت، عدل وانصاف، ایفائے عہد اور سادگی وغیرہ کو اپنائے اور دروغ گوئی، دھوکا دہی، بددیانتی، ظلم اور بدعہدی وغیرہ اخلاق رذیلہ سے اپنے تئیں بچائے کیونکہ انسان اپنی زندگی کے تمام اعمال کا خدا کے سامنے جواب دہ ہے اسی لئے اسلام میں حسن اخلاق اور تعمیر کردار کو مرکزی حیثیت حاصل ہے جس کی تصدیق اس حدیث پاک سے ہوتی ہے "بے شک مجھے اخلاق کی تکمیل کے لئے بھیجا گیا ہے" آپ ﷺ نے اپنے اس ارشاد کا عملی نمونہ اپنی حیات مبارکہ میں پیش کیا جس کی تصدیق خود باری تعالیٰ نے بدیں الفاظ فرمائی کہ

"بے شک آپ بہترین اخلاق والے ہیں"

"بے شک تمھارے لئے اللہ کے رسول کی زندگی بہترین نمونہ ہے"

پس ثابت ہوا کہ اسلام اخلاق حسنہ کی تعلیم دیتا ہے جو احکام الٰہی کے تتبع سے ملتی ہے اور اخلاق حسنہ کا مقصود اللہ کی رضا جوئی ہے چنانچہ اسلام ہر کلمہ گو سے حسن اخلاق کا مطالبہ کرتا ہے اور یہی اسلام کا مقصد حیات ہے۔

Marfat.com

اصل اور نقل

اصل اور نقل دونوں عربی النسل ہیں مگر ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اصل خالص، طبیعت، سرمایہ، جڑ، بنیاد اور ذات ونسب کے معنی دیتا ہے۔ جبکہ نقل نمونہ، نظیر، مثنیٰ، چربہ اور ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

"اصل" حقیقت ہے اس کی سچائی سے مفر نہیں اور "نقل" چونکہ اصل کا چربہ ہے اس لئے ناپسندیدہ ہے۔ کیونکہ "نقل راچہ عقل" کے مصداق نقل کرنے کے لئے زیادہ عقل کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اور نقل اتارنا تو بالکل قبیح اور مذموم حرکت متصور ہوتی ہے۔ نقال کا نقل کرنا (سوانگ بھرنا) اسکا پیشہ ہے، مراسی کا نقلیں کرنا (حکائتیں کہنا) اسکی فطرت ہے۔ مگر ادیب سب سے بڑا نقال سمجھا جاتا ہے۔ وہ دوسروں کے الفاظ واشعار چرا کر اپنے نام سے منسوب کر لیتا ہے۔ البتہ نقل مکان کے دونوں پہلو مثبت ہیں یعنی مجبوری اور مصلحت اور یہ بھی نقل (حدیث) ہے کہ "نقل کفر کفر نباشد" یعنی کسی کے کفر کا ذکر کرنے سے انسان کافر نہیں ہو جاتا مگر ایک طالب علم کا نقل کرنا انگریزی ضرب المثل Copying is Stealing کے مطابق سراسر چوری کرنا سمجھا جاتا ہے۔ جبکہ عدالتی فیصلوں اور دستاویزات نقل کرنے والے نقل نویس کے مدعی، مدعا علیہ اور بائع و مشتری سب مرہون منت ہوتے ہیں۔ اور فارسی ترکیب سے نقل وحمل کا مرکب عطفی باربرداری کے کام کے معنوں کا حامل ہے۔ یہاں یہ امر بھی لطف سے خالی نہیں کہ اگر نقل کی زبر کو پیش سے بدل کر نُقل پڑھا جائے تو اسکا مفہوم ایک قسم کی مٹھائی ہے جو کام ودہن کو بڑا مزا دیتی ہے اور نشہ کے عادی نشہ کی چیزیں کھانے پینے کے بعد تبدیل ذائقہ کیلئے جو میٹھی چیز کھاتے ہیں اسے نُقل کا نام دیتے ہیں۔ اور وہ مسخرہ جو اپنی ذات سے محفل کو تفریح کا سامان مہیا کرتا ہے نُقل محفل / مجلس کہلاتا ہے۔ اور کھانا جو کسی کی موت پر تقسیم کیا جاتا ہے اسے نُقل ماتم کہتے ہیں۔

نقل کے اس بیان کے بعد اب ہم اصل کے اصل الاصول (لب لباب) کا ذکر کرتے

Marfat.com

ہیں۔مشہور مقولہ ہے کہ ''کل شئی یرجع الیٰ اصلہٖ'' یعنی ہر چیز اپنے اصل پر جاتی ہے۔اسے اردو میں یوں کہتے ہیں کہ "اصل سے خطا نہیں کم اصل سے وفا نہیں" یعنی شریف کبھی برائی نہیں کرتا اور رذیل کبھی بھلائی نہیں کرتا۔فارسی میں اس کی متبادل مثل ہے کہ "اصل بد از بدی خطا نہ کند" یعنی کمینے سے بھلائی نہیں اور رذیل بدی سے باز نہیں آتا۔

اصل السُّوس طب کی اصطلاح میں ایک درخت کی جڑ کو کہتے ہیں جو مزے میں میٹھی ہوتی ہے۔بطور دوا مستعمل ہے اردو میں اسے ملٹھی کہتے ہیں یہ کھانسی کے لئے بڑی نافع ہے۔اصیل اصل کا اسم صفت ہے جو شریف اور جوہر دار کے معنی دیتا ہے۔اصیل مرد و زن کے علاوہ گھوڑے اور مرغ بھی اصیل ہوتے ہیں۔ان کے متعلق الگ الگ کہاوتیں بھی ہیں جیسے "اصیل گھوڑے کو چابک کی حاجت نہیں" یعنی کسی شریف آدمی سے کام لینے کے لئے سختی کی ضرورت نہیں ہوتی۔اور "اصیل مرغے ٹکے ٹکے" یہ اس وقت بولتے ہیں جب شریف اور خاندانی لوگوں کی قدر نہ ہو۔

اصول اصل کی جمع بھی ہے اور بطور واحد قاعدہ قانون اور طریقہ ڈھنگ کے معنوں میں بھی مروج ہے۔اصول انفرادی، اجتماعی اور حکومتی سطح پر باندھے ہوتے ہیں جو اصلاح پذیر ہوتے ہیں اور جمع میں اصولیات کی شکل اختیار کرتے ہیں اور یہ اصولی بات ہے۔علمائے کلام نے علم کلام میں مسائل کو عقلی دلائل سے ثابت کرنے کیلئے جو قاعدے وضع کیے ہیں انہیں اصول کلام کہا جاتا ہے۔

اصل اور نقل کی اس بحث کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اصلی اور نقلی اشیاء کے تفاوت کو جانچ پرکھ کر اصل کی قدر کرنا چاہئے اور نقل سے پرہیز۔بس یہی اصلی اور اصولی بات ہے۔ جس میں نقل کی اصلاً کوئی گنجائش نہیں۔

Marfat.com

"ا" سے ایک

"ا" عربی، فارسی، اردو اور پنجابی کے علاوہ ان تمام زبانوں کا پہلا حرف تہجی ہے جن کا رسم الخط عربی سے ماخوذ ہے۔ علم حساب میں یہ ایک ہندسے کی شکل ہے اور جمل میں اس کا ایک عدد مقرر ہے۔ عربی میں اس کی دو قسمیں ہیں (1) ممدودہ (2) مقصودہ ایک کا لفظ اردو میں کئی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ جیسے (ا) واحد، اکیلا (2) یکتا، منتخب (3) یکساں، متحد (4) متفق یکجا (5) نہایت، بہت بڑا (6) کوئی، دوسرا (7) تمام، سارا (8) پورا، پکا (9) سچا، صادق (10) عجیب، نادر (11) سب سے پہلا (12) دہی

ایک اکیلا ہے مگر جب دو ایک یکجا ہو جاتے ہیں تو وہ گیارہ (11) بن جاتے ہیں۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ "ایک اکیلا دو گیارہ" یعنی اتفاق میں برکت ہے۔ ایک ایک ہی ہوتا ہے اور ہمیشہ ایک ہی رہتا ہے اسکی اوّلیت اور عظمت کی واضح دلیل یہ ہے کہ خدا صرف ایک ہے۔۔۔ واحد اور تنہا۔۔۔

ایک اردو کی کثیر الاستعمال مثالوں کے شروع میں آتا ہے۔ جیسے ایک آنکھ میں شہد ایک آنکھ میں زہر۔ یا ایک ایک دم میں سو سو رنگ (متلوّن مزاج شخص)۔ ایک آوے کی برتن یا ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے یا ایک ترکش کے تیر (سب ایک جیسے) ایک اکیلا دوکا میلہ (اتفاق میں برکت ہے) ایک انار سو بیمار یا ایک انگور سو زنبور (چیز کم طلبگار زیادہ) ایک اور دس کا فرق یا ایک اور سو کا فرق (بڑا فرق) ایک انڈا وہ بھی گندا (ایک ہی بیٹا اور وہ بھی نالائق)۔ ایک ایک دن ایک ایک مہینے کے برابر / ایک ایک گھڑی ایک ایک برس سے زیادہ بھاری (انتظار میں وقت نہیں گزرتا)۔ ایک ایک رگ و پے میں نمک (نمک حلال، وفادار)۔ ایک ایک کے دو دو اور بھاگوان کے تین تین (گھمسان کی جنگ)۔ ایک بات ہزار منہ (ہر کسی کا نئی بات کہنا)۔ ایک بولی تین کام (ایک وقت میں کئی کام)۔ ایک پاپی ناؤ کو لے ڈوبتا ہے، ایک مچھلی سارے تالاب / جل کو گندا کر دیتی ہے (ایک نالائق آدمی سارے خاندان کو بدنام کر دیتا ہے)۔ ایک پرہیز سو علاج (پرہیز علاج سے

11268

Marfat.com

بہتر ہے)۔ایک پنتھ دو کاج (ایک تدبیر سے دو کام نکل آنا)۔ایک تن درستی ہزار نعمت (تن درستی بہت بڑی نعمت ہے)۔ایک تنکے کا سہارا (مصیبت میں معمولی مدد بھی کافی ہوتی ہے)۔ایک چوری دوسرا سینہ زوری (قصور بھی کرنا اور پشیمان بھی نہ ہونا)۔ایک کڑوا کریلا دوسرا نیم چڑھا (برے کے لئے برائی کے اسباب پیدا ہونا)۔ ایک توے کی روٹی کیا پتلی کیا موٹی (چھوٹے بڑے سب ایک جیسے)۔ایک جان دو تن (ایک جان دو قالب، گہری دوستی)۔ایک جان ہزار غم (بے حد مصیبتیں)۔ایک حمام میں سب ننگے (ایک برائی میں سب شامل)۔ ایک در بند ہزار در کھلے (آمدن کا ایک ذریعہ بند ہو جائے تو خدا دوسرا کھول دیتا ہے)۔ایک دن کا مہمان دو دن کا مہمان تیسرے دن بلائے جان (زیادہ دنوں کا مہمان دو بھر ہو جاتا ہے)۔ایک شیر مارتا ہے سو گیدڑ کھاتے ہیں (ایک باہمت کی کمائی پر کئی ناکارے پلتے ہیں)۔ایک فرہاد سو تیشے ایک جان سو اندیشے (آدمی کو بہت سی مصیبتیں)۔ایک کرے دس بھریں (ایک کی غلطی کا خمیازہ سب بھگتیں)۔ایک کہے نہ چار سنے (نہ کسی کو برا کہو نہ خود برا سنو)۔ایک کی لاٹھی دس کا بوجھ (ایک شخص پر سارے گھر کی ذمہ داری)۔ایک میان میں دو تلواریں نہیں سما سکتیں (ایک چیز کے دو طلبگار یکجا نہیں رہ سکتے)۔اکی "نہ "سو سکھ / ایک چُپ سو سکھ (نہ اور خاموشی میں عافیت ہے)۔ایک ہاتھ سے تالی نہیں بجتی (دوستی یا عداوت یکطرفہ نہیں ہوتی)۔ایک نور آدمی ہزار نور کپڑا (لباس سے انسان کی خوبصورتی بڑھ جاتی ہے)۔

اب "ایک" کی کہنے سننے اور کرنے کے لئے چند ایک اچھی اچھی باتیں ملاحظہ کیجئے:

ایک بات یا ایک بچن کی کیا بات ہے؟ بات کا پکا اور قول کا سچا انسان ہی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور ایک ہی بات میں کئی باتوں کا اشارہ کر دینا ذہانت کی بات ہوتی ہے۔''ایک نکتے کی بات'' پر ہر کوئی ایک ایک کا منہ تکنے لگتا ہے۔ایک ایک کی چار چار کہنا مبالغہ آمیزی ہے اور ''ایک کی ایک ایک سے کہنا'' لگائی بجھائی متصوّر ہوتی ہے۔مگر مصیبت کا ایک ایک سے احوال کہنا بذات خود ایک مصیبت ہے۔''ایک کی سو سنانا'' اچھی بات نہیں ہوتی مگر دو سن کر ایک کہنا عقلمندی اور بردباری کی بات ہے۔بزبان شاعر یہی بہتر ہے کہ:

کہے ایک جب سن لے انسان دو
زبان حق نے دی ایک اور کان دو

Marfat.com

مگر یاد رہے کہ اچھی اور نصیحت کی بات سن کر ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دینا بہت بری بات ہے اور ہاں برائی کی بات سننے کے لئے ایک کان بہرا اور ایک گونگا کر لینا چاہئے۔

بچہ پاؤں پاؤں چلنا سیکھتا ہے مگر آوارہ گرد ''ایک پاؤں پھرتا'' ہے اس کا ایک پاؤں کہیں اور ایک پاؤں کہیں ہوتا ہے۔ جبکہ خادم ملازم ہر وقت ''ایک پاؤں پر کھڑا رہتا'' ہے۔ سگے بہن بھائی ''ایک ہی سانچے میں ڈھلے'' ہوتے ہیں اور ایک سے ہوتے ہیں اگر ایک کی ایک سے بنی رہے تو اتحاد قائم رہتا ہے اور اگر بگڑ جائے تو نفرت اور دوری پیدا ہو جاتی ہے۔ کہتے ہیں اور سچ کہتے ہیں کہ ''ڈوبتے کو ایک تنکے کا سہارا'' بھی بہت ہوتا ہے۔ مگر ایک سورما بھاڑ کا ایک چنا بھی نہیں پھوڑ سکتا مگر مظلوم جب ایک ہو کر ظلم کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں تو ظلم اور ظالم کا ایک ساتھ ہی خاتمہ ہو جاتا ہے۔

"ایک" کے متعلق کہنے سننے کی بہت سی باتیں ہو چکی ہیں مگر ان میں سے اکثر باتوں کا مقصد "لینا ایک نہ دینا دو" کے سوا کچھ نہیں تاہم ایک دو باتیں تو کم از کم ضرور ذہن نشین کر لینی چاہئیں کہ سب کو ایک آنکھ سے دیکھنا اور ایک سا سلوک کرنا انصاف پسندی ہے مگر سب کو ایک لاٹھی سے ہانکنا زیادتی ہے کیونکہ اس میں مراتب کا خیال پیش نظر نہیں رہتا۔ ہمیشہ ایک رہو اور نیک بنو کہ اسی میں دنیا و آخرت کی فلاح ہے اور ہاں دور حاضر میں عالمی تناظر سیاست کے تناظر میں اس امر کی اشد ضرورت ہے کہ

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے
نیل کے ساحل سے لے کر تابخاک کاشغر

Marfat.com

امید اور نا امیدی

امید کے معنی توقع کے ہیں، نا امیدی اس کا نقیض ہے جبکہ آس اور یاس اس مرکب کا مترادف ہے۔ان مرکبات سے کئی ایک حق وصداقت سے بھرپور مقولے بنے ہیں جیسے:

آسا کبھی نہ پیاسا بے آسا رہے پیاسا۔

جب تک سانس تب تک آس۔

مایوسی گناہ ہے۔

اس کی رحمت سے نا امید ہونا گناہ ہے۔

آس بیگانی جو تکے وہ جیوت ہی مرجائے۔

آس کرے تو پاس آئے۔

امید کے معنی خواہش اور حمل کے بھی ہیں کیونکہ عورت جب امید یا آس سے ہوتی ہے تو وہ امید رکھتی ہے کہ اس کے ہاں لڑکا پیدا ہوگا۔آس اور امید کا تعلق عموماً مستقبل سے ہوتا ہے اور مستقبل غیر یقینی ہوتا ہے۔کیا معلوم آئے کہ نہ آئے؟ اس لئے اس کے جھروکے سے امید و نا امیدی ہر دو طرح کے عکس دکھائی دیتے ہیں۔ اور اسی کے دھندلکے میں امید کی کرنیں بھی دکھائی دیتی ہیں اور نا امیدی کی پرچھائیاں بھی۔اکثر ایسا بھی دیکھنے سننے میں آیا ہے کہ نا امیدی کے چھائے بادلوں سے امید کی بجلی کی چمک بھی پیدا ہو جاتی ہے اور امید کا شجر نو بہار نا امیدی کے جھونکوں سے خزاں کا صیدِ زبوں بھی بن جاتا ہے۔امید اور نا امیدی حالات و واقعات پر مبنی ہوتی ہے اور مقدر کا کھیل بھی۔محنت وکوشش سے امیدیں بر بھی آتی ہیں اور نا امیدی کی نذر بھی ہو جاتی ہیں مگر ہر کسی سے جا و بے جا امیدیں وابستہ نہیں کرنا چاہئیں اور نہ نیکوں سے بدی کی اور نہ بدوں سے نیکی کی امید رکھنا چاہئے۔کیونکہ نیکوں سے نیکی اور بھلائی کے سوا اور بدوں سے برائی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ہاں کسی سے ضرورت سے زیادہ توقعات رکھنے کا نتیجہ ہمیشہ مایوسی کی شکل

Marfat.com

میں ہی نکلتا ہے۔ارادے اور کوششیں اگر نیک اور مستحکم ہوں تو ان کے نتائج اور ثمرات پر نا امیدی کے سائے نہیں پڑتے۔اور اس طرح اگر امیدیں اور مرادیں موہوم اور انہونی ہوں تو ناکامی اور مایوسی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔مختصر یہ کہ امید خوف و خدشات سے نجات دلاتی ہے اور خواہشات سے ہمکنار کرتی ہے۔شاعر حضرات چونکہ اکثر تصورات کی دنیا میں رہتے ہیں اس لئے ان کی امیدیں بھی تصوراتی اور تخیلی ہوتی ہیں۔ صرف دو نمونے پیش خدمت ہیں:

ہمیں ان سے وفا کی ہے امید جو نہیں جانتے وفا کیا ہے؟

جھروکے سے جو وہ جھانکیں اور ہم ان کو دعائیں دیں
اسی امید میں آ کر پسِ دیوار بیٹھے ہیں

کوشش و کار کے علاوہ مانگنے سے بھی امیدیں اکثر پوری ہو جاتی ہیں مگر اللہ کے سوا کسی دوسرے سے مانگنا جائز نہیں کیونکہ ارشاد ربانی ہے کہ "جو مانگنا ہے مجھ سے مانگو میں ہی دینے والا ہوں اور دیتا ہوں اور کسی کو کبھی مایوس نہیں کرتا" اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ارشاد فرمایا کہ "مانگنے والے کو مت جھڑکو" کیونکہ وہ خیرات کی امید لے کر آتا ہے۔لہٰذا اسے مایوس نہیں کرنا چاہئے۔ کسی کی امیدوں پر پورا اترنا اور اپنے فرائض ایمانداری اور وفاداری سے سرانجام دینا۔ بقول شاعر عین ایمان ہے "وفاداری بشرطِ استواری اصل ایمان ہے" آپ جانتے ہیں کہ ایک وفادار ساتھی جب اپنے رفیق کار اور ایک وفادار ملازم اپنے مالکِ واحد کی امیدوں پر پورا اترتا ہے تو اس کی مقبولیت اور قدر و منزلت میں اضافہ ہو جاتا ہے اور اگر اس میں فرض شناسی کا عنصر بھی شامل ہو تو یہ سونے پر سہاگہ ہے۔یہ کلیہ اولاد کے لئے خاص طور پر قابل عمل ہے کیونکہ والدین کی امیدوں پر پوری اترنے والی اولاد یقیناً دنیا و آخرت میں سرفراز ہو کر فلاح پاتی ہے۔

ایک مسافر اپنی منزل پر پہنچنے کی امید لے کر مسافت طے کرتا ہے ایک سالک واصل محق ہونے کی امید میں سلوک کی منزلوں پر منزلیں طے کرتا ہے۔راہ مجاز کا عاشق اپنے محبوب کے دیدار و وصل کی امید کے ساتھ آنکھیں بند کر کے عشق کی آفات و آلام کی اوکھن گھاٹیاں طے کرتا ہے۔ ایک طالب علم حصول کامیابی کی امید میں امتحانوں کے مشکل سے مشکل مرحلے پے در پے طے کرتا ہے۔غرض ہر کوئی اپنی اپنی امیدیں پانے کے لئے اپنی کوششوں اور صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر

Marfat.com

امیدوں کے سہارے زندگی بسر کرتا ہے اور منزلِ مراد پا کر خوشی و شادمانی سے ہمکنار ہوتا ہے اور دوسروں سے امید لگائے بیٹھے رہنے سے عموماً امید لگی ہی رہتی ہے اور بالآخر امیدوار امید و بیم کے عالم میں امید قطع کر کے امید توڑ دیتا ہے۔ مگر اقبال اپنی نوجوان نسل سے قوم کی امیدیں وابستہ کر کے ان کی تربیت کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے امید بھرے لہجے میں کہتا ہے کہ:

نہیں ہے ناامید دہقاں اپنی کشت ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

فاسق و فاجر، عصیاں کار، خطا کار، غلط کار اور گناہگار کبھی اپنے پروردگار کی رحمت و بخشش سے ناامید نہیں ہوتا مگر بقول عمر خیام ضرورت اس امر کی ہے کہ:

باز آ باز آ ہر آنکہ ہستی باز آ گر کافر و گبرو بت پرستی باز آ

امید و یاس کی اس مختصر سی بحث کے بعد میرا تو یہی مشورہ ہے کہ اگر کوئی اپنی حاجت روائی کا امیدوار یا آس مند بن کر آپ کے پاس آئے تو اسے ناامید و مایوس نہ کیجئے کیونکہ اس فعل نیک سے خدا تعالیٰ خوش ہو کر آپ کی حاجتیں اور ضرورتیں پوری فرماتا ہے۔ بحر زندگانی میں غوطہ زن ہو کر ہر مراد پانے کی کوشش کیجئے اور یہ کہہ کر کبھی ہمت نہ ہاریئے کہ:

کوئی امید بر نہیں آتی کوئی صورت نظر نہیں آتی

بلکہ یاد رکھیئے کہ زندگی کا انحصار صرف امید اور تمنا پر ہے مگر داناؤں کا یہ کہنا بھی درست ہے کہ

"کسی سے امیدیں نہ باندھو کیونکہ جب امیدیں ٹوٹ جاتی ہیں تو بڑا دکھ پہنچتا ہے"

Marfat.com

بات

بات میرا موضوع ہے مگر مجھے اس بات کی سمجھ نہیں آتی کہ بات کیا ہے؟ میں بات کو سمجھنے کی کوشش ضرور کرتا ہوں مگر بات ہے کہ اکثر میری سمجھ سے ماورا ہو جاتی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ جہاں کہیں دو شخص ملتے ہیں یا اکٹھے ہوتے ہیں تو بات شروع ہو جاتی ہے۔ کبھی کسی کی بات کبھی کسی کی بات۔ بس پرائی بات پر ہی بات ہوتی ہے۔ اپنی بات پر بات کم ہی کی جاتی ہے۔

کیا بات اتنی ہی فالتو ہے کہ بولنے سے ہو جاتی ہے۔ آخر یہ بات ہوتی ہی کیوں ہے؟ اس کا بس ایک ہی جواب ہے کہ اگر بات نہ ہو تو بولنا ہی نہیں ہوتا اور جب بولنا ہی نہ ہو تو بات نہیں ہوتی کیونکہ جب کوئی بولے گا تو بات ہو گی اور جب کوئی بولے گا ہی نہیں تو بات کیسے ہو گی۔ اور جب کوئی بات نہیں ہو گی تو بات نہیں ہو گی۔ بس میں سمجھ گیا کہ بات بذات خود ایک بات ہے کیونکہ بات ہی کو بات کہتے ہیں اور یہ بولنے سے ہی ہوتی ہے۔ یہ بات بھی عجیب بات ہے کہ بولنے سے بات ہو جاتی ہے اور جب بات ہو جاتی ہے تو بس پھر باتیں بلکہ باتیں ہی باتیں شروع ہو جاتی ہیں۔ کبھی کوئی بات سامنے آتی ہے تو کبھی کوئی بات۔ انسان اگر بات کرنا چھوڑ دے تو نہ بات ہو گی اور نہ اس پر باتیں ہوں گی۔ یوں وہ خود بھی بات کرنے سے بچ جاتا ہے اور دوسروں کی باتیں سننے سے بھی بچ جاتا ہے اور طرح طرح کی باتیں بھی نہیں بن پاتیں۔ مگر اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کہ جب تک کوئی شخص بات نہ کرے تو وہ اپنی باتیں (خیالات) دوسروں تک کیسے پہنچا سکتا ہے اس لئے بات کرنا ہی چاہئے مگر سچی اور کھری اور کبھی کوئی جھوٹی بات نہیں کرنا چاہئے کیونکہ ایک جھوٹی بات کو سچی بات ثابت کرنے کے لئے سو اور جھوٹی باتیں کرنا پڑتی ہیں۔ بات اگر سچی ہو تو لاکھوں جھوٹی باتوں پر بھاری رہتی ہے اس لئے بات ہمیشہ سچی کرنا چاہئے۔ مگر آنکھوں والے کہتے ہیں کہ بات آنکھوں ہی آنکھوں میں ہو جاتی ہے جبکہ رمز شناسوں کا کہنا ہے کہ بات اشارون کنایوں سے بھی ہو جاتی ہے اور کہی بھی جا سکتی ہے اور سمجھنے والے اسے فوراً سمجھ لیتے ہیں۔ ان دونوں طبقوں کی بات پر "فکر ہر کس بقدر ہمت اوست" کی مثال صادق آتی ہے اور دیکھنے جاننے

Marfat.com

والوں کی فہم وادراک کی متقاضی ہے۔

اگر چہ بات سے باتیں بنانا، باتیں گھڑنا، پیدا کرنا اور پھر ان سے کام کی بات نکالنا میری عادت ثانیہ ہے لہٰذا موضوع کو سمجھتے ہوئے میرا مشورہ بس اتنا ہے کہ آپ سب باتوں کو چھوڑ کر میری یہ دو چار باتیں سنیں اور ان پر سوچ بچار کے بعد عمل پیرا ہونے کی کوشش کریں بس اسی میں بھلا بلکہ بھلا ہی بھلا ہے:

1۔ غلط بات کو صحیح بات سے مت ملایئے۔

2۔ سچی بات کو کبھی نہ چھپایئے۔

3۔ بات کو کبھی نہ بڑھایئے۔

4۔ ہر بات کو سنیئے مگر صرف اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی بات کو ہی مانیئے یا پھر

5۔ صرف اپنے من کی بات سنیئے۔

6۔ عورت کی بات پر کبھی نہ چلیں۔

7۔ یاد رکھیں کی اللہ تعالیٰ کو سب باتوں کی خبر ہے۔

"نشستند وگفتند و برخاستند" مگر جو گونگے اور بہرے ہیں وہ سدا آرام میں رہتے ہیں کیونکہ ان پر برا بھلا کہنے سننے کا کبھی بھی الزام نہیں آتا۔ بات کہنے اور سننے کی اس بحث سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ وہی بات کہنی چاہئے جو کہنے کے قابل ہو اور وہی بات سنی چاہئے جو سننے کے لائق ہو۔ اب رہی بات سنی سنائی، ان سنی اور انہونی بات کی تو آپ جانتے ہیں کہ سنی سنائی بات ہوا کی بات یعنی افواہ ہوتی ہے جو قابل یقین نہیں ہوتی اور ان سنی بات کا تو وجود ہی مفقود ہوتا ہے۔ جب وہ سننے میں ہی نہیں آتی تو اسے بات کہنا یا سمجھنا ہی عجیب بات ہے۔ باقی رہی انہونی بات تو اس میں ہونے کی نفی پائی جاتی ہے تاہم اسے دو معنوں میں لیا جاتا ہے اولاً ایسی بات جو وقوع پذیری سے عاجز و عاری ہو۔ ثانیاً ایسی بات جو نا قابل وقوع ہوتے ہوئے وقوع پذیر ہو اس نادر بات کو انوکھی بات بھی کہا جاتا ہے۔ یہ ہو کر ہی رہنے والی بات ہوتی ہے اسے شدنی بھی کہا جاتا ہے۔ اور قسمت کا لکھا بھی سمجھا جاتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ کہی ان کہی باتوں پر یقین کرنا کم عقلی ہے ان کی تصدیق مقدم ہے ورنہ یہی مثال صادق آئے گی کہ "کان کو نہ دیکھنا اور کتے کے پیچھے دوڑ پڑنا"

Marfat.com

دل کی بات دل سے اٹھتی ہے یہ کسی کو نہیں بتانی چاہئے کیونکہ یہ راز کی بات ہوتی ہے اور صرف راز دار سے ہی راز داری سے کہنی چاہئے۔ دل کی بات اکثر دل ہی میں رہ جاتی ہے اور کسی سے کہی نہیں جاسکتی بقول شاعر:

دل کی دل میں رہی بات نہ ہونے پائی　　حیف ہے اس شوخ سے ملاقات نہ ہونے پائی
کہتے تھے کہ یوں کہتے یوں کہتے اگر ملتا　　سب کہنے کی ہیں باتیں کچھ بھی نہ کہا جاتا

چکر کی بات اور چکر دار بات میں بڑا فرق ہے۔ چکر کی بات ہیرا پھیری کی بات ہوتی ہے آکر آدمی چکرا جاتا ہے۔ مگر چکر دار کی بات سراسر دھوکے اور فریب کی بات ہوتی ہے۔ ہوا کی بات ہوتی ہے سنی سنائی ہوتی ہے۔ اسے افواہ جان کر نا قابل یقین قرار دیا جاتا ہے۔ ڈھنگ کی بات اچھی لگتی ہے اور بے ڈھنگی بات بری لگتی ہے وقت کی بات اپنے وقت پر خوب جچتی ہے اور بے موقع کی بات بے وقت کی راگنی کہلاتی ہے اور ایک رات کی بات ہزاروں کی بات ہوتی ہے جس کی تیز روشنیوں کی چکا چوند میں تماش بین رقاصہ کی پائل کی جھنکار پر مدہوش ہو کر اس کے پاؤں پر اوندھا گر جاتا ہے۔ دل لگی کی باتیں دل بہلاوے کی باتیں ہوتی ہیں اور نرم و نازک باتیں دھیمے انداز سے بڑی موثر ہوتی ہیں جبکہ تند و تیز باتوں میں تلخ لہجہ کے باعث نفرت اور کڑواہٹ پیدا ہوتی ہے۔

اگر کسی کی بات بھاری ہو یا بری لگے تو اسکو دبا لینا چاہئے۔ تلخ ہو تو اسے پی جانا چاہئے اسے بڑھانے یا بڑی کرنے سے بات بگڑ جاتی ہے اور بگاڑ بڑھ جاتا ہے۔ اگر بات راز کی ہو تو اسے پھیلانا نہیں چاہئے اس سے شکر رنجی پیدا ہوتی ہے اور جھگڑا بڑھ جاتا ہے۔ بات جو بھی کی جائے سچی کھری اور پکی کی جائے اور اس پر ہمیشہ قائم رہنا چاہئے یہی حق گوؤں اور جوانمردوں کا شیوہ ہے کیونکہ حق سچ کی بات پتھر کی لکیر ہوتی ہے۔ اچھی بات کو پلے باندھ لینا چاہئے اور بری بات کو بھلا دینا چاہئے۔ بہادر اور جوانمرد ہیں وہ لوگ جو اپنی بات کی پاسداری کرتے ہیں اور اپنی بات پر مر مٹتے اور جان دے دیتے ہیں۔

بات کو سن کر بات پالینا عقلمندی اور حقیقت پسندی کی دلیل ہے۔ دوران گفتگو کسی کی بات کاٹنا اور اپنی بات منوانے پر دھونس دینا بری عادت ہے۔ مجلس و آداب کا تقاضا ہے کہ بات چیت تحمل اور بردباری سے کی جائے بڑوں کی بات پر ہنسنا بے ادبی ہے اور چھوٹوں کی بات کو درخور

Marfat.com

اعتنا نہ سمجھنا کم فہمی ہے۔ بات نہ بے پر کی اڑانی چاہئے اور نہ جی سے گھڑنی چاہئے بلکہ ایسی ہونی چاہئے جو دل سے نکلے اور دل میں اتر جائے۔ بے تکی اور بے سروپا بات بے رنگ اور بے اثر ہوتی ہے چاہے اس میں کتنی ہی رنگ آمیزی کی گئی ہو۔ جھوٹی اور دو کوڑی کی بات کے پاؤں نہیں ہوتے اور اسے کسی بھی مقام پر قرار نہیں۔ مگر اچھی اور سچی بات دور دور تک پہنچ جاتی ہے۔ بات دہرانے سے بات جمتی ہے مگر بات جتانے اور بات اچھالنے سے بات جاتی رہتی ہے۔

بات کے لپکے اور چسکے سے بات فروغ نہیں پاتی۔ بات اگر موقع کے مطابق کی جائے تو سنور جاتی ہے۔ اگر رشتے کی بات چل نکلے تو جانچ پرکھ اور سمجھ کر کی جانی چاہئے اور جب طے ہو جائے تو اس سے پھرنا نہیں چاہئے۔ بات کرنے کا انداز اور ڈھنگ ایسا ہونا چاہئے کہ منہ سے پھول جھڑتے نظر آئیں۔ اس بات کو گرہ میں باندھ لینا چاہئے کہ بات کو طول نہیں دینا چاہئے۔ دوسروں کی باتوں میں عیب ڈھونڈنا اور دخل دینا سراسر حماقت ہے۔ یاد رکھنے کی یہ بات بھی ہے کہ بات کے پر بھی ہوتے ہیں اور اسے پر لگ بھی جاتے ہیں جو اڑتے اڑتے کہیں کی کہیں پہنچ جاتی ہے اور منہ سے نکلی ہوئی بات تو ہمیشہ پرائی ہو کر رہ جاتی ہے۔ ایک ہی بات کو پکڑ کر بیٹھ رہنا اور بات کی کھال اتارنے کی فکر میں رہنے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا اسے گئی گزری سمجھ کر خیر باد کہنے میں ہی عافیت ہے۔ کڑوی کسیلی اور ترش و تلخ باتوں کو پی جانا چاہئے۔ بزرگوں اور دانشوروں کی باتیں سنہری ہوتی ہیں انہیں اقوال زریں بھی کہتے ہیں کیونکہ وہ ان کے تجربے کا نچوڑ ہوتی ہیں اور ان میں پوشیدہ مصلحتوں اور نصیحتوں سے درس عمل بھی ملتا ہے لہٰذا ان کی قدر کرنی چاہئے۔ ہنسی مزاح کی باتیں دل لگی کی باتیں ہوتی ہیں جس سے آرزدگی کا مداوا ہوتا ہے۔ اور مجلس کشتِ زعفران بن جاتی ہے۔ البتہ طنز کی باتیں دل میں ہلکی سی چبھن کا باعث ہوتی ہیں مگر بچوں کی معصوم باتیں پیاری پیاری اور بھولی بھالی لگتی ہیں اس لئے بڑی شیریں ہوتی ہیں اور بہت بھلی لگتی ہیں مگر عورتوں کی باتیں اعتبار کے قابل نہیں سمجھی جاتیں۔

باتیں تو بہت ہو چکی ہیں اب بات سے منسوب چند مروجہ ضرب الامثال ملاحظہ کیجئے تا کہ بات کا بھید پایا جا سکے۔

بات بدلی ساکھ بدلی	یعنی بات بدلنے اور وعدہ خلافی سے عزت جاتی رہتی ہے
بات گئی رات گئی	یعنی بات ختم ہوئی قصہ تمام ہوا

Marfat.com

چھوٹا منہ اور بڑی بات	یعنی معمولی آدمی کا بڑا دعویٰ کرنا
سو بات کی ایک بات	یعنی آخری اور حتمی بات، خلاصہ مطلب
بات تھل کی نہ بٹیرے کی	یعنی کبھی وعدہ قول نہیں نبھایا
بات گئی پھر ہاتھ نہیں آتی	یعنی اگر اعتبار اٹھ جائے تو پھر نہیں جمتا
بات لاکھ کی کرنی خاک کی	یعنی باتیں تو بہت بنانا مگر عمل نہ کرنا
بات چلے جانیئے یا بات پڑا جانیئے	یعنی واسطہ پڑنے یا ہمسفر ہونے سے ہی کسی کا حقیقت معلوم ہوتی ہے یعنی (پنجابی میں اس کا متبادل یوں ہے "واہ پیا جانے یا راہ پیا جانے")
بات جو چاہے اپنی پانی مانگ نہ پی	یعنی عزت چاہتے ہو تو کسی کا احسان نہ لو، سوال نہ کرو
بات رہ جاتی ہے وقت نکل / گزر جاتا ہے	یعنی مصیبت تو گزر جاتی ہے مگر برتاؤ یاد رہتا ہے
بات کہیئے جگ بھاتی، روٹی کھایئے من بھاتی	یعنی کھانا من پسند کھائیں مگر بات ایسی کریں جو دوسروں کو بری نہ لگے
بات کا چوکا آدمی، ڈال کا چوکا بندر پھر نہیں سنبھلتا	یعنی مشکل موقع کھونے کے بعد اس کی تلافی مشکل ہے
بات کہی اور پرائی ہوئی / بات منہ سے نکلی ہزار ہیں پڑی	یعنی منہ سے نکلی بات کبھی چھپ نہیں سکتی
بات کی بات لات کی لات / بات کی بات خرافات کی خرافات	یعنی ہنسی مذاق میں اگر کوئی ناگوار بات ہو تو یہ کہتے ہیں

بات کی جمع باتیں اور باتوں ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ بات سے بات نکلتی ہے اور چلتی ہے اور پتہ نہیں چلتے چلتے وہ کہاں سے کہاں تک جا پہنچتی ہے اور باتیں بنانے اور کہنے والے باتوں ہی باتوں میں بہت سی باتیں کہہ جاتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ باتوں سے کام نہیں چلتا مگر بات بنانے والے اپنی باتوں سے بڑے بڑے کام نکال لیتے ہیں لیکن باتوں کے دفتر کھولنے اور اپنی بپتا سنانے سے باتوں کی خاک اڑ جاتی ہے اور بات نہ تو بنی رہتی ہے اور نہ بن پڑتی ہے۔ اب یہاں اگر باتیں بنانے والوں کے کچھ اوصاف و کمالات کا ذکر ہو جائے تو بہتر ہوگا۔

باتیں بنانے والوں کو باتون، بکی، باتونیا یا باتونی کہتے ہیں۔ باتونی باتوں کا دھنی ہوتا ہے

Marfat.com

اسے بہت باتیں آتی ہیں۔وہ باتیں بناتا بھی ہےاور چباچبا کر بھی کرتا ہے۔وہ باتیں کہتا بھی ہے اور اڑاتا بھی ہے۔وہ باتیں سنتا بھی ہےاور سناتا بھی ہے۔وہ باتیں لگاتا بھی ہےاور ملاتا بھی ہے۔اس لئے اسے عرف عام میں باتوں کی پڑیا بھی کہا جاتا ہے۔وہ باتوں کا جمع خرچ بھی کرتا ہےاوران کا تاراور جھاڑ بھی باندھتا ہے۔وہ باتوں کا منہ چومتا ہےاور باتوں کے لچھے سے باتوں کا باغ لگاتا ہے۔وہ دوسروں کواپنی باتوں میں بہلاتا، پھسلاتا، الجھاتااور پھانستا ہےاور کچھ لوگ اسکی باتوں میں آبھی جاتے ہیں اور بعض اسکی باتوں کوتاڑٹٹول کراس کی باتوں کے صدقے قربان بھی جاتے ہیں مگر وہ ہے کہ سب کواپنی باتوں میں دھر لیتا ہے۔بس یوں سمجھئے کہ اس کی باتیں صرف باتیں ہی باتیں ہوتی ہیں۔خالی، چسکے دار،اور بدمزا جوآئینہ ہوجاتی ہیں۔

بس اب بات کی بات بہت ہوچکی۔ بات سے باتیں نکلیں بھی، پھوٹیں بھی وہ ہلکی بھی ٹھہریں اور وزنی بھی مگر بات تو یہ ہے کہ ہمارے ہاتھ یہی بات آئی ہے کہ بات کوئی بھی ہو، کیسی بھی ہواس میں کوئی نہ کوئی بات ضرور ہوتی ہے۔اس سے بات نکالنا چاہئے اوراسے ہنس کے ٹال دینا نہ اچھی بات ہےاور نہ ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دینا احسن سمجھا جاتا ہے۔ہر بات کی ایک آبرو ہوتی ہے اس کا خیال رکھنا چاہئے تا کہ یہ اکارت نہ چلی جائے۔اور جہاں تک بات کہنے کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں بقول شاعر یہی عرض ہے کہ:

کہے ایک جب سن لے انسان دو
زباں حق نے دی ایک اور کان دو

Marfat.com

بلا اور وبا

بلا کثیر المعانی لفظ ہے عام طور پر اس سے مراد بپتا، مصیبت، آفت، قہر اور دکھ لی جاتی ہے۔ یا پھر آسیب، سایہ، جن بھوت اور چڑیل و ڈائن لی جاتی ہے۔ اور وبا کے معنی متعدی بیماری کے ہیں جو ہوا کے خراب ہونے سے پھیلتی ہے۔ بعض اوقات جانوروں سے بھی وبائیں پھیلتی ہیں اور کچھ وبائیں پراسرار بھی ہوتی ہیں۔ وباؤں سے بچنے اور ان کی روک تھام کے لئے علم وبائیات (EPIDEMIOLOGY) کا مطالعہ ضروری ہے۔

بلائیں ناگہانی ہوتی ہیں اور آسمانوں سے نازل ہوتی ہیں اور وبائیں ماحول سے پھوٹتی ہیں اور ہوا کے دوش پر سوار ہو کر اطراف عالم میں پھیلتی ہیں۔ بلائیں قدرتی ہوتی ہیں جیسے گھٹن، حبس، آندھیاں، زلزلے، طوفان، بارشیں اور سیلاب وغیرہ۔ انہیں ہم موسمی بلائیں بھی کہہ سکتے ہیں۔ ان کا انسداد وتدارک انسان کے بس میں نہیں ہوتا تاہم ان کے نزول پر حفاظتی اقدامات بروئے کار لائے جا سکتے ہیں۔ وبائیں طبی نقطۂ نظر سے مختلف قسم کے وائرسوں سے پھیلتی ہیں جیسے نزلہ، زکام، ہیضہ اور چیچک وغیرہ۔ اگرچہ ان کے پھیلنے میں موسمی اثرات کارفرما ہوتے ہیں لیکن ناقص تغذیہ اور بے احتیاطی کا بھی ان کے عام ہونے میں بڑا عمل دخل ہوتا ہے۔ کچھ وبائیں ایسی بھی ہیں جو انسان کی اپنی پیدا کردہ ہیں جیسے رشوت، ذخیرہ اندوزی، منافع خوری، طبقاتی اونچ نیچ، گروہی اور لسانی تعصب، مذہبی اور مسلکی انتہا پسندی، تخریب کاری، دہشت گردی اور گراں فروشی وغیرہ۔ یہ وبائیں عام طور پر بلا جواز ہوتی ہیں اور لاعلاج سمجھی جاتی ہیں

وباؤں کی طرح بلاؤں کو بھی اکثر اوقات انسان از خود دعوت دیتا ہے اور انہیں اپنے پیچھے لگا کر انہیں جھیلنے پر مجبور ہو جاتا ہے اور جب کوئی بلا اس کے سر پر آ پڑتی ہے، اس کے سر منڈھی جاتی ہے یا اس کے گلے پڑ جاتی ہے تو وہ ان کو ٹالنے یا رد کرنے کے لئے طرح طرح کے حربے استعمال کرتا ہے اور نوع بہ نوع کوششیں بروئے کار لاتا ہے۔ ردِّ بلا کے لئے تو وہ خاص طور پر تعویز گنڈے اور درود و وظائف سے بھی کام لیتا ہے تاکہ بلا دور رہے۔ مگر یاد رہے کہ جب

Marfat.com

کوئی بلا آ پڑتی ہے یا پیچھے لگ جاتی ہے تو اس سے نجات پانے اور چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے بڑی حکمت و دانائی اور تدبیر و تدبر سے کام لینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن کسی بلا کو اپنے گلے باندھنا یا اپنے سر لینا پرلے درجے کی حماقت ہے۔ آتش حسد و رشک سے جل بھن کر یا انتقام اور دشمنی لینے کی خاطر بلا کی طرح کسی کے پیچھے پڑنا سراسر مقام انسانیت سے بعید ہے اور باعث بلائے جان ہے۔ البتہ بلا زدہ افراد کی مدد کرنا عین ثواب ہے اور بچوں کی بلائیں لینا عورتوں کا پسندیدہ وتیرہ ہے جسے مردوں کو بھی اپنا لینا چاہئے۔

اگرچہ بلائیں اور وبائیں اپنے اسباب و عمل اور اثرات و تاثرات کے لحاظ سے مختلف ہیں لیکن نتائج اور انجام کے لحاظ سے دونوں ایک ہی سی ہیں۔ دونوں ہلاکتوں اور اموات کے علاوہ املاک و اموال کی تباہی و بربادی کا بھی باعث بنتی ہیں۔ بلاشبہ بلاؤں اور وباؤں کے مسائل و مصائب سے دوچار ہونے پر انسان خود کو مجبور و بے بس سمجھتا ہے اور اظہار عجز سے کام لیتا ہے۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ کوئی بھی بلا بلائے بے درماں نہیں کیونکہ مناسب حکمت عملی، موثر اور نتیجہ خیز اقدامات اور قابل عمل منصوبہ بندی سے صبر و تحمل کے ساتھ ان پر قابو پا لینا ناممکن نہیں مگر اس کے لئے ہمت و استقلال اور جہد و کاوش کی ضرورت ہے۔ اسی لئے ان کی بلا خیزیوں سے نجات حاصل کرنے اور انسانی تحفظ و سلامتی اور فلاح و بہبود کی راہیں نکلتی ہیں۔

Marfat.com

بولنا اور لکھنا

کلام انسانی، مافی لضمیر کے اظہار کا نام ہے۔ اسکی دو صورتیں ہیں۔ تقریر اور تحریر یعنی انسان اپنے دل کی بات بول کر یا لکھ کر بیان کرتا ہے۔ بولنا بھی ایک فن ہے اور لکھنا بھی اور ہر فن کے لئے کچھ گُر اور اصول ہوتے ہیں جنہیں جان کر اور ان پر عمل کرنے سے انسان ماہر فن بن جاتا ہے۔ بولنا انسان کا پیدائشی حق ہے اور پڑھنا لکھنا سیکھنا ہر مرد و زن پر فرض ہے۔ جس کی ادائیگی مہد سے لحد تک جاری رہتی ہے اس حق وفرض کے سلسلے میں کوئی رکاوٹ یا پابندی انسانی بنیادی حقوق میں سراسر زیادتی ہے مگر بولنے اور لکھنے والوں کا بھی یہ فرض ہے کہ وہ ان فنون کے آداب واطوار کو ملحوظ خاطر رکھیں اور حد سے تجاوز نہ کریں مگر برائی کو روکنے اور سچی بات کہنے سے کبھی باز نہیں رہنا چاہئے۔ کیونکہ ان دونوں افعال کو اسلام نے جہاد بالقلم اور جہاد باللسان قرار دیا ہے۔

آج کا دور جمہوریت کا دور ہے اور جمہوری نظام حکومت کا یہ خاصا ہے کہ وہ "By the people of the people for the people" ہوتی ہے۔ اس میں رائے دہی اور تقریر وتحریر کی آزادی ہوتی ہے مگر کارپردازان جمہوریت حق رائے دہی میں دھونس، دھاندلی اور چکر سے اسکی روح کو پامال کر دیتے ہیں اور ارباب حکومت تقریر وتحریر کی آزادی کے دعویدار ہوتے ہوئے "تاب سخن ندارند" کے مصداق طرح طرح کے قدغن لگا کر زبان بندی اور قلم بندی کے احکام صادر فرما کر عوام کے فطری اور جمہوری حق کو سلب کر لیتے ہیں اور یوں روح جمہوریت داغدار ہو کر فنا پذیر ہو جاتی ہے۔

بولنے اور لکھنے کے ان فطری اور سیاسی پہلوؤں کے اظہار کے بعد اب اگر ان کے ادبی اور اخلاقی پہلوؤں پر بات ہو جائے تو بہتر ہوگی۔ طبع انسان میں بولنے اور لکھنے کی صلاحیتیں جدا جدا ہوتی ہیں۔ کسی میں بولنے کی صلاحیت زیادہ ہوتی ہے اور کسی میں لکھنے کی۔ اگر یہ دونوں صلاحیتیں یکجا ہو جائیں تو "سونے پہ سہاگہ" ثابت ہوتی ہیں۔ بولنے والا بے باک ہوتا ہے اور لکھنے والا محتاط۔ بولنے والا اپنے بول سے پھر سکتا ہے مگر لکھنے والے کے لئے فرار ممکن نہیں۔ وہ

Marfat.com

پکڑا جاتا ہے کیونکہ اس کی لکھت ہی اس کا ثبوت ہوتی ہے۔اس میں شک نہیں کہ بولنے کو لکھنے پر اولیت اور فضیلت حاصل ہے اس سے بھی انکار ممکن نہیں ہاں اگر تقریر کو ضبط تحریر میں لایا جائے تو وہ بھی تحریر کی صفات سے متصف ہو جاتی ہے۔آخر میں بولنے کے آداب ومحاسن کے بیان پر اکتفا کرتے ہوئے عرض گزار ہوں کہ:

ہمیشہ سوچ سمجھ کر بولنا چاہئے جیسا کہ کہا جاتا ہے:

"Think before you speak" پہلے تولو پھر بولو۔

جب کہو سچ کہو۔

جب کہو سچ کی بات کہو کیونکہ سانچ کو آنچ نہیں

سچ کا بول بالا جھوٹے کا منہ کالا۔

سچ کہو سچ کہو ہمیشہ سچ کہ ہے بھلے مانسوں کا شیوہ سچ

سچ کہنا اور سدا سکھی رہنا۔

سچائی میں بڑائی اور بھلائی ہے۔

اب ذرا سچ کی تلخ سچائیاں ملاحظہ کیجئے

سچ بات کڑوی لگتی ہے / سچ ہمیشہ کڑوا ہوتا ہے جیسا کہ انگریزی زبان میں کہا جاتا ہے کہ (Truth is always bitter) مگر فارسی والے اس میں اضافہ کرتے ہوئے یوں کہتے ہیں کہ:

سچ اگر چہ تلخ است ولیکن بر شیریں دارد۔

سانچ کہے سو مارا جائے، جھوٹ کہے لڈو کھائے۔

سچ کہنا آدھی لڑائی مول لینا ہے۔

اگر بولنے اور کہنے کی اتنی باتیں یاد نہ رہ سکیں تو کم از کم ان دو باتوں کو کبھی نہ بھولئے:

بولو تو سچ، کہو تو سچ اور تولو تو سچ۔

جب بولو اچھا بولو اور کبھی بڑا بول نہ بولو۔

بقول شاعر:

بڑا بول بولو نہ ہرگز کبھی کہ اس کا نتیجہ ہے شرمندگی

Marfat.com

بے حیائی اور بے غیرتی

بے حیائی، حیا کا جبکہ بے غیرتی، غیرت کا متضاد ہے۔ حیا کے معنی شرم اور جھجک کے ہیں اور غیرت کے معنی پاسِ عزت و آبرو اور نام و ناموس کے ہیں۔ شرم کے احساس و اظہار کا پتہ آنکھوں سے چلتا ہے اور عزت و ناموس کی پاسداری کا احساس دل و دماغ کی سوچ و فکر کا نتیجہ ہوتا ہے جس کے لئے انسان اپنی انا کا مسئلہ بنا کر کچھ بھی کر گزرتا ہے۔ حیا عورت کا زیور ہے اور غیرت کو مرد کی مردانگی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مگر عورت کی حیا کا پردہ جب اٹھ جائے تو اسکی آنکھوں کا پانی مر جاتا ہے اور وہ بے راہ روی کا شکار ہو کر مذہبی، اخلاقی اور سماجی تمام حدیں پار کر جاتی ہے وہ کسی کے روکے نہیں رکتی۔ جہاں تک کہ وہ زینت بازار بن کر دعوت گناہ دیتی ہے اور مرد اپنی فطری کمزوری کے باعث اس کا شکار بن کر عورت کے احترام اور اس کے تحفظ کے فرض کو بھلا دیتا ہے اسکی آبرو سے کھیلتا ہے اور اپنی عزت کو داغدار بنا کر ذلیل و رسوا ہوتا ہے۔ مرد کا جب احساس غیرت ختم ہو جائے تو وہ بے غیرتی پر اتر آتا ہے اس کے جوہر مردانگی کی آب و تاب مٹ جاتی ہے اس کی انا مر جاتی ہے اور وہ نام و ناموس کی پاسداری کا فریضہ ادا نہیں کر پاتا اور یوں وہ مرد کے نام کو بدنام بلکہ بے نام کر کے رکھ دیتا ہے اور دوسرے لوگ اسے مرد کہنے اور سمجھنے میں شرم محسوس کرتے ہیں۔

تاریخ عالم شرم و حیا اور عزت و غیرت کے ساتھ ساتھ بے شرمی، بے حیائی، بے عزتی اور بے غیرتی کے واقعات سے بھری پڑی ہے اور روزمرہ کی زندگی میں ہمیں ایسے ہی واقعات سننے اور دیکھنے کا اتفاق ہوتا رہتا ہے۔ جن سے ہمیں خوشی بھی ہوتی ہے اور دکھ بھی، سبق بھی ملتا ہے اور عبرت بھی، ہمارے جذبات اور احساسات کو ٹھیس بھی پہنچتی ہے اور تحریک بھی ملتی ہے۔ یہ تاثر حالات و واقعات کے تناظر میں ابھرتا ہے مگر ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم بے حیائی اور بے غیرتی کے اسباب و علل جان کر ان کی روک تھام کیلئے موثر اور قابل عمل رویہ بروئے کار لائیں تا کہ ہم خود کو اور اپنی نسل نو کو ان کے تند و تیز طوفانوں سے بچا سکیں۔

Marfat.com

بلاشبہ شرم وحیا ہو یا عزت وغیرت، بے شرمی و بے حیائی ہو یا بے عزتی و بے غیرتی سب کا تعلق فطری احساس سے ہے۔ مگر دیکھنا یہ ہے کہ ان کے فروغ و تدارک کے کونسے اقدامات کو بروئے کار لانا ضروری ہے۔ اس ضمن میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ میڈیا کا قبلہ درست کیا جائے، فحش لٹریچر کی اشاعت پر پابندی لگائی جائے، تھیٹروں اور سینما گھروں کو تالے لگا دیئے جائیں، رقص وسرور اور ناچ گانے کی محفلوں پر قدغن عائد کیا جائے، حسن کے بازار بند کر دیئے جائیں، ٹی وی اور کیبل والوں پر پابندی لگائی جائے کہ وہ ہیجان انگیز اور اخلاق باختہ ڈراموں اور پروگراموں کو پیش کرنے سے لازماً پرہیز کریں۔ معلمین کو چاہیئے کہ وہ اپنی درسگاہوں کے ماحول کو ہر لحاظ سے اسلامی، اخلاقی اور اصلاحی بنانے کی بھرپور سعی کریں تا کہ ان کے متعلمین کی صحیح خطوط پر تربیت ہو سکے اور وہ صحیح معنوں میں معماران قوم کہلانے کے مستحق بن سکیں۔ یاد رہے کہ اگر ہم نے انفرادی اور اجتماعی سطح پر اصلاح کن کوششوں سے کام نہ لیا تو ہماری نسل نو بداخلاقی، بے حیائی، اور بے غیرتی کے بڑھتے ہوئے طوفانوں میں گھر کر تباہ ہو جائے گی۔ آیئے ہم سب مل کر اپنے مستقبل کے وارثوں کو فلاح کی راہ پر لائیں ورنہ تاریخ ہمیں کبھی معاف نہیں کرے گی۔

اگر چہ بات ذرا طول پکڑ گئی ہے مگر اسکی طوالت پر ہمیں کچھ افسوس بھی نہیں ہے بلکہ ہمیں مناسب اور جائز لگتی ہے۔ تاہم ہم اس طوالت کو دور کرنے کے لئے موضوع کو کچھ اس طرح سمیٹنے کی کوشش کرتے ہیں کہ حیا اور غیرت کے توازن پر کوئی آنچ نہ آنے پائے۔ کہتے ہیں کہ ایک حیا جنت کو لے جاتی ہے اور ایک حیا دوزخ کو لے جاتی ہے، ایک غیرت ناموری کا باعث بنتی ہے اور ایک غیرت ذلت و رسوائی کا باعث ہوتی ہے۔ ہماری دعا ہے کہ خداوند قدوس عورت کو حیا اور مرد کو غیرت کی لاج پالنے اور رکھنے کی توفیق دے تا کہ وہ زن و مرد کے درجے سے گرنے نہ پائیں۔

Marfat.com

پتنگ اور پتنگا

پتنگ مونث ہے اور پتنگا مذکر ہے۔ پتنگ کاغذی ہوتی ہے مگر پتنگا ایک ذی روح پرندہ ہے۔ پتنگ اور پتنگا میں صرف الف کا فرق ہے۔ پتنگ سے اگر الف کو جوڑ دیا جائے تو وہ پتنگ سے پتنگا بن جاتی ہے اور اگر پتنگا سے الف کو جُدا کر دیں تو وہ پتنگا سے پتنگ بن کر رہ جاتا ہے۔ یوں دونوں اپنی جنس تبدیل کر کے مونث سے مذکر اور مذکر سے مونث بن جاتے ہیں مگر دونوں میں ایک قدر مشترک ہے۔ دونوں اُڑتے ہیں لیکن یوں بھی ان میں فرق ہے اور وہ یہ کہ پتنگ اُڑائی جاتی ہے اور پتنگا خود اُڑنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ پتنگ ڈور کے سہارے فضا میں اُڑتی ہے اور پتنگا عشق کی بدولت شمع کے گرد گھوم گھوم کر شمع کی لو میں جل کر امر ہو جاتا ہے۔

پتنگ کو انگریزی میں کائٹ (Kite) اور پنجابی میں گڈی کہتے ہیں۔ پتنگ ہندی زبان کا لفظ ہے جس کا ہندی میں متبادل لفظ کنکوا ہے۔ کنکوے کے علاوہ اس کے معنی ایک چھوٹا سا پردار کیڑا بھی ہے جو روشنی پر گرتا ہے اُردو میں اسے پتنگا اور فارسی میں پروانہ کہتے ہیں۔

اُردو والوں نے پتنگ / کنکوے اور پتنگے سے کئی دوسرے مرکبات وضع کر رکھے ہیں۔ مثلاً: پتنگ بڑھانا۔ پتنگ / کنکوا اُڑانا۔ پتنگ / کنکوا کاٹنا۔ پتنگ / کنکوا لڑانا۔ پتنگا ہونا یعنی پھرتی سے کوئی کام کرنا۔ پتنگے لگنا یعنی غصے سے بدن میں آگ لگنا۔ پتنگے لگانا یعنی شرارت کرنا، آگ لگانا اور لگائی بجھائی کرنے والی عورت کو پتنگ چھری کہا جاتا ہے۔

پتنگ بازی ایک شوقیہ کھیل ہے جس میں بچے بوڑھے اور مرد و زن سب حصہ لیتے ہیں اور اتنی مستیاں کرتے ہیں کہ کھیل کے شیدائی سودائی نظر آتے ہیں۔ چھتوں، پارکوں اور میدانوں میں پتنگ باذی کے مقابلے ہوتے ہیں۔ اِن مقابلوں کے ساتھ ساتھ تو آجکل لباس وغیرہ میں بھی جدتیں آ گئی ہیں۔

بسنت اگرچہ ایک ہندووانہ تہوار ہے جو ہر سال وسط فروری میں منایا جاتا ہے مگر پاکستان اور بنگلہ دیش میں بھی یہ نہ صرف منایا جاتا ہے بلکہ دھوم دھام سے منایا جاتا ہے اور

Marfat.com

اِسے بسنت میلہ کا نام دیا جاتا ہے جس کا اہتمام شہر شہر اور گاؤں گاؤں کیا جاتا ہے۔ آج کل تو اِس میلے کو حکومت کی اشیر باد بلکہ سر پرستی بھی حاصل ہو چکی ہے۔

بسنت رات کو تو وہ ادھم اُٹھتا ہے کہ "بوکاٹا" کے شور سے کانوں پڑی آواز سُنائی نہیں دیتی۔ آتش بازی، ڈھول دھمکا اور فائرنگ کی ٹھاہ ٹھاہ سے راتوں کی نیند حرام ہو جاتی ہے۔ دھاتی تار اور کیمیکل ڈور سے بجلی میں بار بار تعطل پیدا ہوتا رہتا ہے۔ صنعتی نظام درہم برہم ہو جاتا ہے اور کروڑوں کا نقصان ہو جاتا ہے اور بے موت ہلاکتیں واقع ہو جاتی ہیں اور پتنگ اُڑانے اور لوٹنے والے مختلف قسم کے حادثوں سے دوچار ہو کر اور مجروح و مضروب بن کر ہسپتالوں میں جا پہنچتے ہیں مگر افسوس کہ اس کافرانہ کھیل کے تدارک و انسداد کے لیے نہ حکومت کوئی قدغن لگاتی ہے اور نہ پتنگ بازی کے شائقین کے ذہن میں یہ بات آتی ہے۔ حیف، صد حیف۔

Marfat.com

پنجر اور پنجرہ

پنجر اور پنجرہ بھی خاکؔ اور خاکہ کی طرح ملتے جُلتے الفاظ ہیں جن میں صرف ''ہ'' کا فرق ہے۔ پنجر کے ساتھ اگر ''ہ'' کو ملا دیں تو وہ پنجرہ بن جاتا ہے اور اگر پنجرہ کی ''ہ'' اُڑا دیں تو وہ پنجر بن کر رہ جاتا ہے۔

معنی کے لحاظ سے پنجر ڈھانچے کو کہتے ہیں جو بے جان ہوتا ہے اور پنجرہ قفس کو کہتے ہیں جو جانداروں کے لیے ہوتا ہے جس کا ڈھانچہ عام طور پر لوہے یا لکڑی کی سلاخوں سے بنایا جاتا ہے جس کے سوراخوں سے بند جانوروں کی خبر گیری کی جاتی ہے۔ اِسی لحاظ سے خاکہ بھی ایک ڈھانچہ ہوتا ہے جو کسی شخص کا لکیر دار آئینہ ہوتا ہے جس میں سے جھانک کر شخصیت کو تاکا جا سکتا ہے۔ یہ لکھا بھی جاتا ہے، کھینچا بھی جاتا ہے اور اُڑایا بھی جا سکتا ہے۔ اس کی نوعیت کا انحصار خاکہ نگار کی افتادِ طبع کا رہینِ منت ہوتا ہے۔ بادی النظر میں پنجرہ اور قید کا مفہوم توام ہے ۔ پنجرہ اور پنچھی کا تعلق جڑواں نظر آتا ہے۔ یہ ایک بندی خانہ ہے جس میں پنچھی کے پنکھ کاٹ کر سدا کا قیدی بنا دیا جاتا ہے مگر وسیع النظری میں اس کی وسعت بے پایاں ہے۔

جسم روح کا پنجرہ ہے، دہن زبان کا اور کھوپڑی دماغ کا پنجرہ ہے۔ ہاسٹل بورڈرز کا پنجرہ ہے اور ہسپتال مریضوں کا پنجرہ ہے۔ حوالات ملزموں کا پنجرہ اور جیل مجرموں کا پنجرہ ۔ طالب علم سکول یا مدرسے کے پنجرے میں بند رہتے ہیں اور چھٹی کے وقت یوں نِکل کر دوڑتے ہیں جیسے ایک پنچھی پنجرے کی قید سے نِکل کر اُڑتا ہے۔ ادارے اور دفاتر بھی پنجروں سے کم نہیں جس میں اہلکار اوقات کار میں بند و پابند رہتے ہیں اسی طرح تربیّت گاہیں تربیّت پانے والوں کے نزدیک پنجرے ہی سمجھی جاتی ہیں۔

چڑیا گھر بھی جیل کی طرح ایک بڑا پنجرہ ہے جس میں جانوروں کے ڈربے، پرندوں کے گھونسلے اور درندوں کے لیے جنگلے بنے ہوتے ہیں۔ یہ سب پنجرے ہی تو ہیں جن میں اُنہیں قید کر کے رکھا جاتا ہے۔

Marfat.com

مکان زندوں کا پنجرہ ہے جسے وہ اپنی مرضی سے کھولتے اور بند کرتے ہیں اور قبر مردوں کا پنجرہ ہے جو ایک بار بند ہو کر دوبارہ کبھی نہیں کھلتا گویا وہ سدا کا قید خانہ ہے۔

عاشق کا دِل عشق کا پنجرہ ہے جس میں محبوب کی تصویر اور اُس کی یاد مستقل بسیرا رکھتی ہے اور نگاہ میں ہمیشہ محبوب ہی سمایا رہتا ہے یہاں تک کہ تصویر کے پنجرے میں سدا خیال یار اور تصویر جاناں مقیّد رکھتے ہیں مگر رہائی پانے کی کوشش میں گھوم پھر کر بے بس ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اور اسیرانِ حرص وہوس تو ہمیشہ خواہشات کے پنجرے میں بند رہتے ہیں۔

کتاب بھی ایک پنجرہ ہے جس میں حالات وخیالات بند کئے جاتے ہیں۔ جنہیں پڑھ پڑھا کر پھر کتاب میں بند کیا جاتا ہے۔

پس ثابت ہوا کہ پنجرہ قید یا پابندی کی علامت ہے اور قید وبند کی کئی قِسمیں اور صورتیں ہیں جیسے: قیدِ محض، قیدِ سخت، قیدِ تا برخاست عدالت، قیدِ تنہائی، قیدِ سلاسل، حبسِ بے جا، حبس دوام وغیرہ۔

نجات اور رہائی قید کے متضاد ہیں اور پنجرہ قید بندی کا دوسرا نام ہے اور پنجرہ قیدی کے انجر پنجر ڈھیلے کر دیتا ہے اِس لیے بہتر یہی ہے کہ پنجرے کی کھڑکی کھول دی جائے تا کہ قیدی آزاد ہو کر باقی ماندہ زندگی اپنی مرضی سے گزار سکے۔

Marfat.com

پیار اور بیوپار

پیار انس وموانست اور الفت ومحبت ہے اور بیوپار کاروبار اور دھندہ ہے۔ پیار، لاڈ، مامتا، التفات دوستی اور میل ملاپ کا نام ہے۔ جبکہ بیوپار لین دین، خرید وفروخت اور سوداگری ہے۔ پیار ایک جذبہ ہے جو دل میں پیدا ہوتا ہے آنکھوں سے جھلکتا ہے اور زبان سے ظاہر ہوتا ہے اس کا تعلق دل سے ہے۔ پیار جب بڑھ جاتا ہے تو وہ عشق کا روپ دھار لیتا ہے جبکہ بیوپار مال واسباب سے ہوتا ہے اور زر ومال سے بڑھتا اور چمکتا ہے عقل سے اس کے ہیر پھیر کا کام چلتا ہے۔ بیوپاری کے حربوں اور ہتھکنڈوں سے پرانا، ناکارہ اور بوسیدہ مال بھی ہاتھوں ہاتھ بک جاتا ہے۔ اور اس کے جائز وناجائز ہونے کا انحصار بیوپار کی نیت اور طرز عمل پر ہوتا ہے۔ اسکی ذہنیت تاجرانہ ہوتی ہے اسکی سوچ ہمیشہ نفع ومفاد پر مرتکز رہتی ہے وہ ہر نوع نفع کمانے اور نقصان سے بچنے کی فکر ودھن میں لگا رہتا ہے لیکن پیار کرنے والا پیا، پریتم یا معشوق کہلاتا ہے اس کی ہر حرکت اور ادا سے خلوص واخلاص ٹپکتا ہے۔ وہ ایثار پیشہ ہوتا ہے۔ پیار کرنا اس کا اوڑھنا بچھونا ہوتا ہے۔ وہ ہر کسی کو پیار کی آنکھ سے دیکھتا ہے، پیار کی پیاری پیاری باتیں کرتا ہے۔ وہ اپنے پیارے کو اپنے پیار کا محور ومرکز خیال کرتا ہے اور اس کی پیاری پیاری اداؤں پر جان چھڑکتا ہے۔ اسی لئے وہ اسے پیارا لگتا ہے۔ جبکہ بیوپار تو صرف بیوپار ہے اور پیار بہت کچھ بلکہ سب کچھ ہوتا ہے۔ وہ عشق بھی ہے اور حسن بھی، وہ یگانہ بھی ہے اور بیگانہ بھی، وہ دلکش بھی ہے اور قابل قدر بھی وہ لین دین میں کھرا ہوتا ہے۔ وہ پیار کے بدلے میں صرف پیار چاہتا ہے۔ وہ اپنی ہر شے پیار کے نام وقف کر دیتا ہے۔ وہ اپنے پیار کی خاطر کسی چیز کے دینے میں دریغ نہیں کرتا اور یوں وہ ہر صورت میں اپنا پیار ظاہر کر کے ظاہر ہوتا ہے۔

بیوپار ہمیشہ کسی ایک جنس کا ہوتا ہے مگر پیار کی دو جنسیں ہوتی ہیں۔ ایک مردانہ پیار جبکہ دوسرا زنانہ پیار۔ پیار کی ان ہر دو اقسام میں ارمان ایک قدر مشترک ہوتا ہے مگر مردانہ پیار میں ایک مردانگی اور رعب ودبدبہ ہوتا ہے جبکہ زنانہ پیار میں ایک گونہ وجاہت اور دلکشی ہوتی ہے۔ مردانہ

Marfat.com

پیار کا اظہار دلیرانہ اور برملا ہوتا ہے۔ جبکہ زنانہ پیار میں پوشیدگی ہوتی ہے۔ مردانہ پیار کے انداز عاشقانہ ہوتے ہیں اور زنانہ پیار کے انداز دلبرانہ ہوتے ہیں جس میں خود سپردگی اس کی انتہا ہے اور یہی وہ مقام ہے جس میں عاشق ومحبوب دو قالب ہوتے ہوئے ایک جان ہو جاتے ہیں اور من وتو کی تمیز مٹ جاتی ہے "من تو شدم تو من شدی تا کس نہ گوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری"

بیوپاری کبھی گھاٹے کا سودا نہیں کرتا وہ اپنا مال کبھی کوڑیوں کے مول نہیں بیچتا۔ جلب منفعت ہمیشہ اس کے پیش نظر رہتی ہے مگر پیار کرنے والا نفع ونقصان کی کبھی نہیں سوچتا۔ اس کا پیار ہمیشہ قربانی کا متقاضی رہتا ہے۔ وہ پیار کے بول ہی بولتا رہتا ہے اور اپنی ہر شے پیار کے داؤ پر لگائے بیٹھا رہتا ہے جہاں تک کہ وہ اپنی ذلت و رسوائی کو بھی خاطر میں نہیں لاتا۔ وہ بقول شاعر "بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا" اپنی بدنامی کو بھی اپنی ناموری پر محمول کرتا ہے مگر اپنے پیار (معشوق) کی رسوائی ہرگز ہرگز نہیں چاہتا۔ چاہے اسے اپنی جان پر ہی کیوں نہ کھیلنا پڑے۔

بیوپار منفعت کوشی کا دوسرا نام ہے اور پیار صرف جی کا زیاں۔ منفعت کوشی بیوپار کی خشت اول ہے مگر پیار کی بنیاد جی کے زیاں پر ہوتی ہے۔ بیوپار کماتا ہے اور پیار کھوتا ہے۔ بیوپار کما کما کر زندہ وتابندہ رہتا ہے اور پیار بہت کچھ کھو کھو کر پیار حاصل کرتا ہے۔ وہ پیار کی خاطر موت کو گلے لگا کر امر ہو جاتا ہے اور مر کر اپنے پیار کو جلا اور تابندگی بخشتا ہے۔ نفع خوری سے بیوپاری کی پیاس اور بھڑکتی ہے مگر پیار کی پیاس ہمیشہ پیاسی ہی رہتی ہے۔ بیوپار میں خرید وفروخت اور لین دین ہوتا ہے مگر پیار نہ خریدا جا سکتا ہے نہ بیچا جا سکتا ہے۔ یہ انمول ہوتا ہے اور صرف قربانی کا متقاضی رہتا ہے۔ بیوپار میں کوشش وکار کارگر ہوتی ہے مگر پیار تعلق و واسطہ اور رشتہ وناطہ کی بنیادوں پر استوار ہوتا ہے۔ بیوپار کی طرح پیار بھی مختلف النوع ہوتا ہے۔ پیار ہر تعلق اور رشتے کی بنیاد پر ہوتا ہے جس سے اسکی نوعیت کا تعین ہوتا ہے۔ ماں باپ سے پیار، بہن بھائیوں سے پیار، عزیز و اقارب سے پیار، دوست احباب سے پیار، خدا سے پیار، محبوب سے پیار، جان سے پیار، دنیا سے پیار، مال وزر سے پیار، دین سے پیار، کرنی سے پیار، اپنے جملہ متعلقات سے پیار۔ غرض کس کس سے پیار اور کس کس کا پیار شمار کیا جائے۔ پیار کی انواع واقسام کا احاطہ ناممکن ہے۔ مگر یاد رہے کہ ممتا کا پیار سب سے اولیٰ اور افضل ہے۔ ہر پیار اس کے مقابلے میں ہیچ اور بے قدر ہے۔ اور وہ پیار جو حرص وہوس کا متمنی ہو ہر حال میں قابل مذمت ونفرت ہے۔ ایسا پیار ہر لحاظ سے سفلہ،

Marfat.com

کمینہ، اور مذموم ہوتا ہے۔ ایسا پیار صرف سوداگری اور بیوپار ہے کیونکہ حرص وہوس بیوپار اور صرف بیوپار کا خاصا ہوتا ہے اس لئے پیار کو محض عشق وعاشقی سمجھنا اور اسے اس کے حدود میں محدود کر دینا پیار کی اہمیت و ماہیت کے شعور وآگہی سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔ یہ کم فہمی اور نادانی ہے اور پیار کی سراسر توہین ہے۔ حرص وآز کی تکمیل کی خاطر جو لوگ اپنے محبوب ومعشوق کو محور ومقصد سمجھ کر پیار کا نام دیتے ہیں وہ پیار کی آن اور شان کو داغدار کر کے نہ صرف ہوس پرست ہونے کا ٹائیٹل لے کر پیار کے پیارے لفظ کی توہین کے مرتکب ہوتے ہیں اس لئے وہ پیار کے بجائے پیار کے نقیض (نفرت) کے مستحق ہیں۔ ان کو ہرگز منہ نہیں لگانا چاہئے کیونکہ وہ ملعون ہیں انہیں نفرت و ملامت کے تیروں سے چھلنی کر دینا چاہئے۔ لیکن معاشرتی زندگی میں "پیار دو اور پیار لو" کا کلیہ بڑا کارگر ثابت ہوتا ہے۔

کہتے ہیں کہ پیار کے خوشنما اور تناور درخت کی جڑ حسن ہے کیونکہ حسن ہی پیار کو جنم دیتا ہے اور دل کو اپنی طرف مائل کرتا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ حسن کا تعلق دیدۂ بینا سے ہے۔ وہی چیز حسین ہے جسے نگاہ حسن دیکھتی ہے۔ یہ نگاہ کا کمال بھی ہے اور قصور بھی۔ جس چیز کو جس آنکھ سے دیکھا جائے وہ ویسی ہی نظر آتی ہے۔ اس کے حسن کا دارومدار دیکھنے والے کی آنکھ میں ہوتا ہے۔ وہ جیسا محسوس کرتا ہے وہ ویسا ہی دکھائی دیتا ہے۔ سچ ہی ہے کہ ''لیلیٰ کے دیکھنے کو مجنوں کی آنکھ چاہئے'' اس حقیقت کو مولانا شبلی نے اپنے پیارے انداز میں بڑی خوبصورتی سے واضح کرتے ہوئے کہا ہے کہ ایک مالی کی نگاہ میں گل کی کیا اہمیت ہے اور ایک پنساری اسے کس نظر سے دیکھتا ہے۔ مگر ایک شاعر اسے دیکھ کر بے ساختہ پکار اٹھتا ہے کہ ''اے گل بتو خرسندم تو بوئے کسے داری''

دیکھا جو حسن یار طبیعت مچل گئی
آنکھوں کا تھا قصور چھری دل پہ چل گئی

المختصر پیار پیار ہے اور بیوپار بیوپار ہے۔ پیار کو پیار سمجھ کر کیجئے مگر بے لگام نہ چھوڑیئے۔ اسے بیوپار نہ بنایئے اور نقصان کے خدشے سے محفوظ رہیئے۔ اسی انداز فکر سے پیار کی انسیت و اہمیت کا احساس اجاگر رہے گا اور یہ حقیقت بھی واضح ہوگی کہ پیار زندگی میں صرف ایک بار ہی کیا جاتا ہے۔

Marfat.com

تخت اور تاج

تخت اور تاج ایک دوسرے کے لازم وملزوم ہیں۔تخت بغیر تاج کے اور تاج بغیر تخت کے بے معنی ہیں۔دونوں کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہے ایک کے بغیر دوسرے کا تصوّر تک ممکن نہیں ہے۔فارسی مرکب تخت وتاج کا مفہوم (مُلک وسلطنت) اِسی حقیقت کا عکاس ہے۔

تخت اور تاج کے الفاظ عربی الاصل ہیں لیکن فارسی اور اُردو میں بعینہٖ استعمال ہوتے ہیں۔ہندی میں تخت کو سنگھاسن اور تاج کو مُکٹ کہتے ہیں جبکہ تاج انگریزی میں (Crown) کہلاتا ہے۔تخت پر براجان ہونے والا تاجدار یا تاجور کہلاتا ہے جو ملک وسلطنت کا مالک ومختار سمجھا جاتا ہے۔مختصراً تخت سے مُراد مقام ومسندِ حکمرانی ہے اور تاجور سے مُراد حکمران ہے۔

تخت چوکی، گدی اور مسند کے معنی دیتا ہے۔عام طور پر اِسے راج گدی کے معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔دیگر معانی میں اِس سے مُراد وہ تخت بھی مُراد ہے جو سجا کر محرم کے جلوس میں نکالا جاتا ہے جس پر اربابِ نشاط مرثیہ پڑھتے ہوئے نکلتے ہیں نیز اس سے مُراد وہ تخت بھی ہے جس پر شادی بیاہ کے موقع پر لڑکے ناچتے اور نعرے لگاتے ہوئے نکلتے ہیں علاوہ ازیں اِس سے مُراد ہاتھی دانت وغیرہ سے بنی ہوئی وہ تختی بھی مُراد ہے جو تاروں کو طبلہ کی سطح سے ذرا اوپر اُٹھائے رکھتی ہے۔تخت کی دوسری اقسام میں تخت عاج مشہور ہے جو ہاتھی دانت سے بنا ہوتا ہے اور کنایۃً دن اور معشوق کی ساقِ بلوریں کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے اِسی طرح تخت آبنوسی ہے جو آبنوس کی سخت سیاہ اور وزنی لکڑی سے بنا ہوتا ہے اور کنایۃً رات کے معنی دیتا ہے۔ان کی تیسری قِسم تختِ رواں/تخت ہوائی ہے جسے ہوادار پالکی بھی کہہ سکتے ہیں اور اُڑن کھٹولہ بھی۔یہ تخت کی وہ قِسم ہے جس پر بادشاہ سوار ہو کر نکلتا تھا۔اس کی چوتھی قِسم تختِ طاؤس/طاؤسی ہے جو ہندوستان کے مغل شہنشاہ شاہجہان نے بنوایا تھا۔اور اس کی پانچویں اور آخری بلکہ سب سے اعلیٰ وافضل قِسم تخت سلیمان/سلیمانی ہے جس پر حضرت سلیمانؑ بیٹھ کر اُڑا کرتے تھے۔مگر عجب بات تو یہ ہے کہ سہاگ رات کو تخت کی رات اور نکاح کے وقت دلہن کے

Marfat.com

پہنے ہوئے سرخ جوڑے کو تخت کی لال کسوت کہا جاتا ہے۔

تختہ تخت کی تصغیر اور تختی اس کی تانیث ہے جو بے شمار مفاہیم میں استعمال ہوتے ہیں۔ عام طور پر اس سے مُراد تختہ سیاہ لی جاتی ہے جس پر چاک سے لکھ کر طالب علموں کو سکھایا جاتا ہے یا پھر اس سے تختۂ مشق کا مفہوم لیا جاتا ہے جسے لڑکوں کے مشق کرنے کی تختی کہتے ہیں مگر تختہ کی دو مشہور اِقسام ہیں ایک تختۂ مرگ جس پر مردے کو نہاتے ہیں اور دوسری تختۂ تابوت جس پر مردے کو لے جاتے ہیں۔ تختہ اُلٹ جانا/ دینا/ اُلٹانا تباہی و بربادی کے لیے محاورۃً استعمال ہوتا ہے اور تخت یا تختہ فارسی کی مشہور مثل ہے جو کامیابی یا موت کے انجام کا مفہوم ظاہر کرتی ہے۔

تختہ کی طرح تختی کی بھی دو مشہور اِقسام ہیں۔ ایک لوحِ مزار اور دوسری وہ جس پر بچے لکھنے کی مشق کرتے ہیں مگر وہ تختی پر تختی رکھنے کو منحوس خیال کرتے ہوئے اکثر اُردو کی یہ مشہور مثل بولتے ہیں کہ " تختی پر تختی میاں جی کی آئی کم بختی"

اب رہا سوال تاج کا تو بادی النظر میں اِس سے مُراد شاہی ٹوپی ہے مگر یہ مکان کے چھجے اور گنجفے کی پہلی بازی کے علاوہ پرندوں کی کلغی کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے جیسے تاجِ ہُد ہُد، تاجِ خروس (مُرغ) اور تاجِ طاؤس (مورؑ) جسے اُردو میں مور مُکٹ کہتے ہیں وغیرہ۔ لطف کی بات تو یہ ہے کہ شعلے کا شعلہ بھی تاجِ شمع کہلاتا ہے۔ چونکہ تاج عظمت و احترام کی دلیل سمجھا جاتا ہے اس لیے اکثر اس کی نسبت سے نام بھی رکھے جاتے ہیں مثلاً تاج دین، تاج محمد یا تاج بی بی اور تاج محل مگر نام رکھنے سے کوئی تاجدار نہیں بن سکتا اور نہ جوڑ توڑ کرنے والے اور ستاروں کا ملاپ اور توڑ کرنے والے بے تاج بادشاہ تاجور کہلاتے ہیں مگر مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر اور افغان بادشاہ بے تاج ہو جانے پر بھی بادشاہ ہی کہلاتے چلے آرہے ہیں۔

تاج کے اس ذکر سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس کا تعلق بہر حال سر سے ہے اور جس طرح جسم کا بالائی حصہ ہونے کی وجہ سے بلند ترین مقام رکھتا ہے اس طرح تاج پوش بھی سب سے افضل ترین، بلند ترین اور علو مرتبت متصوّر ہوتا ہے اور لائقِ تعظیم و اطاعت ہوتا ہے اِس لحاظ سے شوہر کو سرتاج کہا جاتا ہے۔ تاج پوشی کو عزّت اور تکریم کے ساتھ ساتھ خوش پوشی اور خوشنمائی کی علامت بھی سمجھا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عورتیں خصوصاً دُلہنیں سونے اور چاندی کے بنے قیمتی اور چمکدار تاج سر پر سجا کر خوش اور خوشنما ہونے کی دِلداہ ہوتی ہیں۔

Marfat.com

کبھی وقت تھا کہ تاج وتخت کا مالک شاہ، بادشاہ، شہنشاہ یا سلطان کہلاتا تھا اور اپنے لیے مختلف القابات وخطابات اختیار کرتا تھا۔ کوئی خسرو کہلاتا تھا۔ کسی کو قیصر کہا جاتا تھا اور کوئی زار کہلاتا تھا۔ دُنیا کو فتح کرنے کا سکندر کا خواب ادھورا رہ گیا اور وہ شاہِ جہان کا لقب نہ پا سکا مگر ہندوستان کے دو مغل بادشاہ شاہجہان اور جہانگیر کے لقب سے محض تاجدارِ ہند ہوتے ہوئے جہانگیری اور شاہجہانی کے دعویدار بھی بنے رہے۔

وہ زمانے بھی گزر گئے جب تخت وتاج کو وراثت کا حِصّہ سمجھا جاتا تھا اور زور آور وارث دیگر وارثان کو اس حق وراثت سے محروم کر دیتا تھا یا پھر کوئی قتل وغارت کا بازار گرم کر کے بزورِ شمشیر دوسروں سے تاج وتخت چھین کر قبضہ جما لیتا تھا۔ تاجپوشی کی رسم وروایت بھی زمانے کے ساتھ ساتھ مٹتی اور بدلتی گئی۔ جمہوریت کے جدید دور میں تاجپوشی کی جگہ حلفِ وفاداری رواج پا چکی ہے تاہم آج بھی تاج پوشی ایک اعزازی ریت کے طور پر چل رہی ہے۔ کسی ادیب یا شاعر کی نگارشات پر یا حسن کا مقابلہ جیتنے والی حسیناؤں کے لیے تاجپوشی کا اہتمام بطور خاص کیا جاتا ہے مگر فقراء وعلماء کی رسمِ دستار بندی بدستور تاجپوشی کہلاتی ہے اور پہلوانی کا گرز پہلوانوں کے لیے تاج ہی متصوّر رہوتا ہے۔

المختصر تخت وتاج کا حصول ایک شاہی جنون ہے جو اِنسان کو پاگل بنا دیتا ہے۔ تاریخ عالم شاہد ہے کہ تخت وتاج جنگ وجدل اور قتل وغارت کے بغیر نہیں ملتا۔ یہ جنون اِنسان کو باپ، بیٹے اور بھائیوں جیسے خونی رشتوں سے بھی بیگانہ کر دیتا ہے اور حصولِ تخت وتاج کے بعد وہ خودسر اور مغرور بن جاتا ہے اور بزبانِ شاعر اس حقیقت کو فراموش کر دیتا ہے کہ:

جس سر کو غرور آج ہے یاں تاجوری کا　　کل اس پہ یہیں شور ہے پھر نوحہ گری کا

یہاں تک کہ وہ خدا کو بھی بھول کر خدا بن بیٹھتا ہے۔ عیش وطرب، لہو ولعب اور ظلم وتشدّد کو اپنا کر خود اپنے برے انجام کے اسباب پیدا کر لیتا ہے۔ اس کا سکون ختم ہو جاتا ہے اور جانے انجانے خوف اسے پریشان کرتے رہتے ہیں اور یوں انگریزی مثل اس پر حرف بحرف صادق آتی ہے کہ:

Uneasy lies the head that wears the crown.

میرا خیال ومشورہ تو یہی ہے کہ تخت وتاج (اقتدار) کی حرص وہوس میں انسان

Marfat.com

کو چاہیئے کہ وہ اپنی عاقبت کو خراب نہ کرے بلکہ تخت نشینانِ خاک (فقراء) کی سی قناعت، سادگی اور عاجزی اختیار کر کے اطمینانِ قلب اور روحانی بادشاہت کے مزے لوٹے اور کسی تاجور کے خوف وخطر سے بے نیاز اور محفوظ ہو رہے اور صرف ایک ہی تاجدار (تاجدارِ مدینہ ﷺ) کی غلامی اختیار کر کے یہی ورد کرتا ہے کہ

" اے تاجدارِ حرم! ہو نگاہِ کرم "

Marfat.com

تدبیر اور تقدیر

تدبیر اور تقدیر دونوں عربی کے مونث الفاظ ہیں تدبیر کے معنی فکر کرنا اور سوچنا کے ہیں۔ آگا پیچھا سمجھ کر انجام پر نظر رکھنا ہے۔ تجویز بتانا اور نصیحت کرنا کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں حکمت و چالاکی اور چارہ و علاج کا مفہوم بھی رکھتا ہے اور کسی کو زک پہنچانے کی کوشش کرنے کے معنی بھی دیتا ہے اور

تقدیر کے معنی قِسمت، نصیب اور مقسوم کے ہیں یعنی اندازۂ قدرت جو اللہ تعالیٰ نے ہر شے کے لئے روزِ ازل سے مقرر کر رکھا ہے۔ مقدّر اس کا ہم معنی لفظ ہے۔

تدبیر کی بھی جاتی ہے اور چلائی بھی جاتی ہے۔ یہ سوجھتی بھی ہے اور بتائی بھی جاتی ہے۔ یہ بن بھی پڑتی ہے اور اُلٹ بھی جاتی ہے۔ یہ لڑی اور لڑائی بھی جاتی ہے۔ تدبیر گر مُدبّر کہلاتا ہے۔ اور اگر اس کی تدبیر فاسد ہو تو اسے مفسد سمجھا جاتا ہے۔ اور تقدیر لکھی ہوتی ہے اور اس کا لکھا پورا ہو کر رہتا ہے۔ یہ موافق بھی ہوتی ہے اور ناموافق بھی۔ یہ کھوٹی بھی ہوتی ہے اور کھری بھی۔ یہ کھل بھی جاتی ہے اور لوٹ بھی جاتی ہے۔ یہ بن بھی جاتی ہے اور بگڑ بھی جاتی ہے۔ یہ سیدھی بھی ہوتی ہے اور اُلٹی بھی ہوتی ہے۔ یہ جاگ / چمک بھی پڑتی ہے اور سو / کھو بھی جاتی ہے۔ یہ اُلٹ / پُلٹ بھی جاتی ہے اور پھر / پھرا بھی جاتی ہے یعنی بدل بھی جاتی ہے اور بگڑ بھی جاتی ہے غرض اس کے کھیل نرالے ہیں اور اس کے چکر ہمیشہ چلتے رہتے ہیں اور اس کے آگے کسی کی نہیں چلتی۔ تقدیر والے کو تقدیر کا سکندر کہتے ہیں اور تقدیر کا ہیٹا ہمیشہ تقدیر کو کوستا اور روتا رہتا ہے۔

تدبیر اور تقدیر دونوں کے لئے وقت کا عمل دخل بڑا اہم ہے۔ دونوں کو اس کی ضرورت ہوتی ہے۔ وقت بدلتا رہتا ہے اور یادیں چھوڑ جاتا ہے مگر تقدیر نہیں بدلتی اس کا لکھا انمٹ ہوتا ہے اور وقت پر ہو کر رہتا ہے اور تدبیر کے لئے بھی وقت در کا ہوتا ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ تدبیریں بھی بدلتی رہتی ہیں مگر انتہا پسندوں نے تدبیر کو قدر اور تقدیر کو جبر جان کر قدریہ اور جبریہ الگ الگ گروہ بنا رکھے ہیں جو ہمیشہ آپس میں متحارب و متصادم رہتے ہیں اور ایک

Marfat.com

دوسرے کی بات کو ماننا تو درکنار سننے تک کے روادار نہیں۔

کاروبار کو چمکانے، مقصد کو پانے، دوستی اور دشمنی کو نبھانے، کھانے کمانے غرض زندگی بتانے کے لئے انسان طرح طرح کے پاپڑ بیلتا ہے۔ سینکڑوں حربے عمل میں لاتا ہے۔ دوسروں کو فریب دیتا ہے اور خود بھی دھوکا کھاتا ہے۔ دوسروں کو نفع ونقصان پہنچاتا ہے اور خود بھی نفع ونقصان پاتا ہے۔ یہ سب کچھ کیا ہے اور ایسا کیوں ہے؟ یہ سب تدبیریں ہی تو ہیں۔ برآئیں تو ثمر بار ورنہ خاردار۔ مگر ایسا نہیں ہے کیونکہ ان کا انجام ہمیشہ تقدیر کے مطابق ہوتا ہے۔ تقدیر اچھی تو انجام اچھا۔ تقدیر بُری تو انجام بُرا۔ جبھی تو فارسی کی یہ ضرب المثل زبان زدِ خاص وعام ہے کہ

تدبیر کند بندہ تقدیر زند خندہ

یعنی تقدیر کے آگے تدبیر نہیں چلتی اور وہی کچھ ہوتا ہے جو منظورِ خُدا ہوتا ہے۔ صاحبانِ تدبیر کا کہنا ہے کہ تدبیر سے تقدیر بدل جاتی ہے اور صاحبانِ یقین وایمان کا عقیدہ ہے کہ "تقدیر بدل جاتی ہے دعاؤں کے اثر سے"

اب آپ فیصلہ کرلیں کہ کیا بدلتا ہے اور کون کس کو بدلتا ہے؟ کیا تقدیر تدبیر کی محتاج ہے یا تدبیر تقدیر کے تابع ہے؟ میں تو بس اتنا کچھ ہی جانتا ہوں کہ

تدبیر تقدیر کو نہیں بدل سکتی تاہم اگر کوئی تدبیر سوجھے تو اسے چلانا ضرور چاہیئے ہوسکتا ہے کہ وہ کارگر ثابت ہو مگر تقدیر سے زور نہیں چلتا۔ مقدر کے آگے کسی کی نہیں چلتی تقدیر / مقدر کا لکھا کبھی نہیں مٹتا جو مقدر میں ہوتا ہے وہی ملتا ہے۔

مختصراً میرا عقیدہ اور مشورہ یہی ہے کہ تدبیر سے تقدیر کو آزمانہ چاہیئے اور انجام کو مقدر پر چھوڑ دینا چاہیئے کیونکہ قسمت خدا بناتا ہے سب کچھ اسی کے قبضہ میں ہے۔ اگر انسان کے بس میں ہوتا تو ہر کوئی بادشاہ ہوتا کوئی گدا نہ ہوتا اور نہ ہی کوئی انسان مجبور و بے بس ہوتا یہ سب مالک کے ہاتھ میں ہے۔ کسی کو بادشاہ، کسی کو وزیر، کسی کو اسیر، کسی کو غریب اور کسی کو فقیر بنا دیتا ہے۔ بقول شاعر:

کوئی شے تیرے کرم سے بے نیاز ملی نہیں میری جھولی ہی تنگ ہے تیرے یہاں کمی نہیں

Marfat.com

تہمت اور بہتان

تہمت اور بہتان عرب نژاد بہن بھائی ہیں۔تہمت چھوٹی ہے اور بہتان بڑا ہے۔ان کا تعلق بدگمانی کی نسل سے ہے اور ان کا خاندان شک وشبہ کا خاندان کہلاتا ہے۔جھوٹ ان کا مورثِ اعلیٰ ہے۔ان کا جنم تراش سے ہوتا ہے۔بعض خلش اور عداوت کو ان کی وجہ پیدائش بتاتے ہیں۔ان کا بچپن خراش اور چبھن میں گزرتا ہے۔جوانی خواہشِ انتقام میں پروان چڑھتی ہے اور زندگی دنگا فساد اور قتل وغارت کا میدانِ کارزار بن کر تباہی وبربادی اور موت پر جا منتج ہوتی ہے۔

تہمت اور بہتان مترادف الفاظ ہیں جو الزام اور بدنامی کے معنی دیتے ہیں۔یہ اُٹھنا/ اُٹھانا،لگنا/ لگانا، بندھنا/ بندھانا، تراشنا، جوڑنا دھرنا، دینا، لینا اور رکھنا وغیرہ افعال سے مل کر استعمال ہوتے ہیں مگر ان کی بنیاد جھوٹ پر رکھی جاتی ہے اور کوئی پرکھ پرچول اور تصدیق تحقیق نہیں کی جاتی یہی وجہ ہے کہ یہ افواہ کی طرح پھیل کر کسی کی شخصیت کو داغدار کر دیتے ہیں اسی لئے ان کی بے اصلی کو کردار کشی کا اصل حربہ قرار دیا جاتا ہے۔ان کا لگایا ہوا داغ دھونے کے لئے ان کی اصلیت اور حقیقت جان کر شاید مہیا کرنے کے لئے خاصہ وقت لگتا ہے مگر اس کے باوجود لگے داغ کے مٹنے کی اُمید شاید ہی پوری ہوتی ہے۔چونکہ یہ دونوں بہن بھائی بذاتِ خود اپنی الزام تراشی اور افترا پردازی کی وجہ سے بدخصلت اور غلط کار ہیں اس لیے وہ دوسروں کو بھی اپنا سا سمجھنے لگتے ہیں یا انہیں اپنا سا بنانے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔افترا پردازی کا شمار افعال بد میں سرِ فہرست ہے۔یہ فعل بدعورتوں اور سیاستدانوں کی سرشت میں داخل ہوتا ہے کہ وہ جب چاہیں، جو چاہیں اور جس پر چاہیں افترا باندھ کر اپنا اُلو سیدھا کر لیتے ہیں مگر یہ ان کی کم فہمی ہے کیونکہ دوسروں کو اُلو بنانے کی کوشش میں ان کا اپنا اُلو بھی بول جاتا ہے مگر وہ اس سے بے نیاز اور بے خبر ہو کر اپنی اھن میں لگے رہتے ہیں جو سراسر حماقت ہے۔اسی لئے افترا پرداز کو جھوٹ کی پوٹ یا جھوٹ کا پتلا کہہ کر احمق گردانا جاتا ہے لیکن اسلامی شریعت میں یہ بات قابلِ تعزیر جرم ہے جس کی سزا اسّی کوڑے متعین ہے۔

Marfat.com

پولیس کے جھوٹے مقدموں (شراب، جوا، ناجائز اسلحہ، آوارہ گردی، اغوا، حدود وغیرہ) کا شمار بھی اسی قبیل میں ہوتا ہے جو وہ ناراض ہو کر، کسی کے کہنے پر یا پھر کبھی بارگیننگ کے لئے قائم کرتی ہے جسے عوام اس کی کرشمہ سازیوں کا نام دے کر شکوہ سنج رہتے ہیں اور اپنی بے بسی و بے چارگی پر نوحہ کناں رہتے ہیں۔ یہی حال بعض ایجنسیوں، کمشنوں اور انکوائری کمیٹیوں کا ہے جو معاملات کو کھٹائی میں ڈال کر سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ ثابت کرنے کے لئے جھوٹی رپورٹوں کا طومار باندھ دیتی ہیں مگر عدالتی تحقیق و تفتیش کی رپورٹیں لاجواب سمجھی جاتی ہیں جو بال کی کھال اتار کر اور حقیقت کی تہہ کو پہنچ کر حق و انصاف کے تحت تیار کی جاتی ہیں بلاشبہ افترا پردازی سراسر جھوٹ اور بدنیتی پر مبنی ہوتی ہے مگر عجب بات تو یہ ہے کہ اس کا جھوٹ سفید جھوٹ ہونے کی باوجود بھی اس امر کی نفی کر دیتا ہے کہ ''جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے'' یا ''جھوٹ کی ناؤ نہیں چلتی'' مگر یہ چلتے چلتے اپنے تئیں سچ بن کر دکھانے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور جھوٹ موٹ اُڑا کر دوسروں کی شخصیّت کا جنازہ نکال دیتا ہے۔

بس میری تو یہی دعا ہے کہ خدا تعالیٰ ان دونوں بہن بھائیوں کو عقل سلیم عطا فرمائے اور راہِ راست دکھائے تا کہ وہ جھوٹی سچی کہنے، ہانکنے اور اُڑانے سے باز رہیں اور ہم سب بہن بھائیوں کو بھی ان کی بداطواری کے اثر سے دور اور محفوظ رکھے اور یہ توفیق بخشے کہ ہم جھوٹے کے گھر تک پہنچ کر اس کا منہ کالا کر سکیں۔

Marfat.com

تیزی اور تُندی/تلخی اور تُرشی

تیزی اور تندی فارسی کے مونث الفاظ ہیں اور ہم معنی سے ہیں اور بے شمار مفاہیم کو واضح کر تے ہیں مثلاً تلخی، چڑچڑا پن۔ سختی، غصہ، ظلم۔ گرم مزاجی، غضبنا کی۔ گرمی، گرانی۔ مانگ، ضرورت۔ پھرتی، جلدی وغیرہ مگر "تیزی" صفر کے مہینہ اور "تُندی" شہوت کے معنوں میں میں منفرد ہیں۔ جبکہ

تلخی اور ترشی بھی فارسی مونث ہونے کے ناطے تیزی اور تُندی کے قریبی رشتے دار ہیں۔"

تلخی" اپنی سختی اور کڑواہٹ کے باعث "تیزی" کے قریب تر ہے اور "تُرشی" اپنی کھٹاس اور بدمزگی کے باعث "تیزی" اور "تُندی" سے ذرا دور سے رشتہ استوار کرتی ہے۔

تیزی وتُندی اور تلخی وتُرشی سب میں ایک صفت مشترک ہے اور وہ یہ تمام اسمائے کیفیت ہیں۔ تیزی "تیز" سے اور تُندی "تُند" سے، تلخی "تلخ" سے اور تُرشی "تُرش" سے مشتق ہے جو سب بطور اسمائے صفت استعمال ہوتے ہیں اور بطور سابقہ مختلف اسمائے فاعل کی ترکیب کے کام آتے ہیں جیسے

<u>تیز سے</u>: تیز رو۔ تیز رفتار۔ تیز پرواز۔ تیز دست۔ تیز دندان۔ تیز زبان۔ تیز مزاج۔ تیز طبع۔ تیز قدم۔ تیز گام۔ تیز گوش۔ تیز قلم۔ تیز دماغ وغیرہ۔

<u>تُند سے</u>: تُند خو۔ تُند مزاج۔ تندرفتار۔ تُند فہم وغیرہ۔

<u>تلخ سے</u>: تلخ زبان۔ تلخ کام۔ تلخ گفتار۔ تلخ نگاہ۔ تلخ نوا۔ تلخ جواب وغیرہ۔

<u>تُرش سے</u>: تُرش رو۔ تُرش مزاج وغیرہ۔

علاوہ ازیں یہ الفاظ مرکباتِ عطفی کی صورت میں بطور ہم معنی بھی استعمال ہوتے ہیں جیسے تیز وتُند یا تیزی وتُندی اور تلخ وتُرش یا تلخی وتُرشی۔

اب ہم ان کے اچھے برے اثرات سے چند مفید اور قابل عمل نتائج اخذ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

Marfat.com

تیز اور تیزی: تیز پروازی اور تیز رفتاری اگرچہ مسافت کی راہ میں خطرناک ہے لیکن تخیّل کے میدان میں علوخیالی اور مضمون آفرینی میں معاونت دیتی ہے۔

تیز دست اور تیز گام (قدم) اپنے کام اور سفر کو جلد جلد ختم کر لیتا ہے اور تیز طبع اور تیز فہم اپنی عقل و ذہانت کی بدولت اپنے مقاصد کو پالیتا ہے مگر

تیز زبان اور تیز مزاج اپنی تیز زبانی اور تیز مزاجی کے باعث ہمیشہ ناکام و ذلیل ہوتا ہے تیز ہونا یا تیزی کرنا کسی نوع مفید ثابت نہیں ہوتا۔

تُند اور تُندی:

مافوق فقرات میں تیز اور تیزی کی جگہ تُند اور تُندی کے استعمال سے ایک سے مفاہیم متبادر ہوتے ہیں لیکن شاعرِ مشرق کی یہ نصیحت لازماً قابلِ یقین و عمل ہے کہ:

تُندیِ بادِ مخالف سے نہ گھبرا اے عقاب
یہ تو چلتی ہے تجھے اونچا اُڑانے کے لئے

البتہ تیز و تُند شراب سے اجتناب ضروری ہے جو انسان کو مدہوشی کے عالم میں از خود رفتہ کر دیتی ہے۔

تلخ اور تلخی:

تلخ بات اور تلخ جواب ہمیشہ ناگوار گزرتے ہیں تلخ زبان اور تلخ گفتار شخص ہمیشہ ذلیل و خوار ہوتا ہے۔

تلخ گوئی اور تلخ نوائی سے ہمیشہ تلخی (ناگواری اور دشمنی) پیدا ہوتی ہے اور بڑھتی ہے۔
تلخ عیش شخص اور تلخ کام عاشق کی زندگی ہمیشہ برے حال میں گزرتی ہے۔
البتہ تلخ نگاہی بڑے کام کی چیز ہے ہمیں تلخ ہو کر تلخی پیدا کرنے سے ہر چند بچنا چاہیئے۔

تُرش اور تُرشی:

تُرش اور تُرش مزاج کو کوئی پسند نہیں کرتا اگر مقبولیت درکار ہو تو تُرش روئی اور تُرش مزاجی سے ہر چند اجتناب ضروری ہے کیونکہ تُرش ہونا تُرشی پیدا کرنے کا سبب ہوتا ہے۔ لہٰذا
تلخ و تُرش گفتار و افعال سے ہمیشہ بچنے کی کوشش کرنی چاہیئے تاہم "تلخ و تُرش چشیدن" دنیاوی زندگی کا لازمہ ہے جس سے مفر نہیں۔

Marfat.com

ثواب اور عذاب

ثواب اور عذاب عربی الاصل متضاد الفاظ ہیں۔ثواب بدلہ، معاوضہ، اُجرت اور جزا کے معنوں میں اور عذاب اذیّت ،دُکھ، تکلیف اور سزا کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ مختصراً ہم انہیں جزا اور سزا کے مفہوم میں محدود کر سکتے ہیں۔

ثواب میں عوض معاوضہ ہے اور عذاب میں عتاب کا عنصر غالب ہوتا ہے مگر ''صواب'' املا کے لحاظ سے ثواب سے مختلف ہے جو صرف راست، خوب اور نیک کام کا مفہوم رکھتا ہے مگر ثواب کی طرح اس سے اجر و معاوضہ کا اظہار نہیں ہوتا۔

ثواب اور عذاب کا تصوّر اِسلام کا بنیادی عقیدہ ہے۔ یہ ہماری دنیاوی اور اخروی زندگی کا محور ہے۔ نیکیوں اور نیک کاموں کا صلہ دنیا کی عارضی زندگی میں بھی ملتا ہے اور آخرت کی ابدی زندگی میں بھی۔

''دَہ دنیا، ستّر آخر'' کے بمصداق عارضی زندگی کے نیک اور درست اعمال کا اجر و انعام ابدی زندگی میں کئی گنا بڑھ کر ملتا ہے۔ بعینہٖ اعمالِ بد کی سزا بھی آخرت میں ملتی ہے جو بڑے کربناک اور عبرتناک عذاب (جو سب سے بڑا عذاب ہے) کی صورت میں ہوتی ہے۔ نیکی کے بدلے جنّت اور کوثر و سلسبیل کی نعمتیں مقدّر بنتی ہیں اور بدی کے عوض جہنّم اور دہکتے ہوئے کوئلوں کی مسلسل اذیّتیں ملتی ہیں۔

جنّت کے لالچ اور جہنّم کے خوف دلانے کے پسِ پردہ خالقِ حقیقی نے ہماری زندگی کی جو راہیں متعیّن فرمائی ہیں ان پر گامزن ہونے میں ہی ہماری فلاح و بہبود مضمر ہے اور یہ بات بڑی اہم ہے کہ احکامِ خداوندی کی بجا آوری کے سبب زندگی نہ صرف بنتی سنورتی ہے بلکہ دیگر مذاہب کے پیروکاروں کے لئے مثال بھی ثابت ہوتی ہے۔

ہندو عقیدہ میں سورگ اور نرگ یعنی جنّت اور دوزخ کے اعتقاد میں اور یہود و نصاریٰ اور مجوسیوں کے عقائد میں بھی جزا و سزا کا تصوّر موجود ہے مگر ان میں وہ بات نہیں جو اِسلامی

Marfat.com

تصورِ ثواب وعذاب میں ہے۔ "یہ تو ہم خرما وہم ثواب" والی بات ہے یعنی احکام الٰہی کی اطاعت کی سعادت کے ساتھ ساتھ انعام واکرام کا استزاد ___ دوہرا فائدہ ___ مزے ہی مزے۔

موجودہ دور مافیاز کا دور ہے جن کی سرگرمیاں (لوٹ مار، قتل وغارت گری، قبضہ گیری، دہشت گردی وغیرہ) ان گنت عذابوں میں شمار ہوتی ہیں۔ دکانوں، مکانوں اور شاہراہوں کے تجاوزات سدِ راہ ہونے کی وجہ عذابِ جاں سے کم نہیں۔ آسمانی آفتوں، سیلابوں، زلزلوں اور طوفانوں کے عذاب اس پر مستزاد ہیں۔

ثواب وعذاب کے تصور کی اس یاددہانی کے بعد اب یہ آپ کی صوابدید پر ہے کہ آپ اپنے اندازِ عمل اور طرزِ حیات میں ثواب حاصل کرنے کا ارادہ باندھتے ہیں یا عذاب جھیلنا پسند کرتے ہیں۔ بہتر تو یہی ہے کہ ہم پاداشِ اعمال کی وجہ سے عذابِ الٰہی میں گرفتار نہ ہوں اور بے سود کاموں سے گریز کریں تاکہ ہم پر ''ثواب نہ عذاب کمر ٹوٹی مفت'' کی مثال صادق نہ آنے پائے اور ہاں فاتحہ درود کا ثواب مردوں کو اکثر پہنچاتے رہا کریں تاکہ مرنے کے بعد ان کا حق ادا ہوتا رہے۔ مزید یہ کہ دوسروں کو نیکوکاری کے ساتھ ساتھ کارہائے ثواب پر آمادہ کرنے کے لئے تاکید وتلقین کرتے رہیں اور بذاتِ خود بھی اس پر کاربند رہیں کیونکہ یہی ہماری اطاعت شعاری اور سعادت مندی کا تقاضا ہے۔ خدائے عزوجل ہم سب کو توفیقِ رفیق عطا فرمائے۔ مزید برآں ہمیں ہر وقت یہ دعا مانگتے رہنا چاہیئے کہ

ربنا اتنا فی الدنیا حسنة وفی الاخرة حسنة وقنا عذاب النار

آمین

Marfat.com

جبر اور صبر

آگ اور پانی کی طرح جبر اور صبر بھی ایک دوسرے کے متضاد ہیں میں تو کہوں گا کہ جبر عین آگ ہے اور صبر مانند پانی ہے۔ جبر اور صبر متضاد ہونے کے ساتھ ساتھ ہم وزن اور ہم قافیہ بھی ہیں۔ جبر علم حساب میں کسروں کا اختصار کہلاتا ہے اور جبر و مقابلہ علمِ ریاضی کی وہ شاخ ہے جسے الجبرا کہتے ہیں اس میں علامتوں اور حرفوں کے ذریعے عمل کیا جاتا ہے اور معلوم مقداروں کے ذریعے نامعلوم مقداریں دریافت کی جاتی ہیں۔

جبر کے معنی ظلم و تعدّی، جور و ستم ہیں اور صبر شکر و تحمل اور تسلیم و رضا کا نام ہے۔ جبر ذہنی خرابی ہے اور صبر دِلی خوبی ہے۔ جبر خلش ہے اور صبر اس کا مرہم ہے۔ جبر آتشِ سوزاں ہے اور صبر آبِ خنک۔ جبر زبردستی و زیادتی ہے اور صبر تحمل و برداشت ہے۔ جبر بُرائی ہے اور صبر اچھائی ہے۔ جبر بدعا ہے اور صبر نیکی ہے۔ جبر شیطانی صفت ہے اور صبر صفتِ ربانی ہے۔ جابروں کا ساتھی شیطان ہوتا ہے اور صابروں کا ساتھی رحمان ہوتا ہے۔ جبر اِنسان کو جابر اور صبر صابر بنا دیتا ہے۔ جبر سے اِنسان مجبور اور صبر سے مصبور بن جاتا ہے۔ جبر کا ثمر تلخ و تُرش ہوتا ہے اور صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔ جبر باعث تشویش ہے اور صبر باعثِ تسکین۔

جبر بولتا ہے اور صبر چُپ رہتا ہے۔ جبر سے شور برپا ہوتا ہے اور صبر سے خاموشی چھا جاتی ہے جیسا کہ ''ایک چُپ سو سُکھ'' کی مثل مشہور ہے۔ جبر جابر کی چال ہے اور صبر اُس کی ڈھال ہے۔ اِسی چلن سے ان کی تشخیص ہوتی ہے۔ جبر آفت ہے اور صبر عافیت ہے۔ جبر شر ہے اور صبر خیر ہے۔ جبر عصبیّت ہے اور صبر مظلومیّت ہے۔ جبر جفا کاری ہے اور صبر اس کا استیصال ہے۔ جبر فنا پزیر ہے اور صبر کو بقائے دوام حاصل ہے۔

جبر و صبر کا مرکب متضاد مفہوم کا حامل ہے۔ جبر جب ضبط کا مفہوم دیتا ہے تو جبر اور صبر ہم معنی بن جاتے ہیں۔ دِل و جذبات پر جبر کر کے جب صرب کا دامن تھام لیا جاتا ہے تو احساسِ جبر مجبور ہو کر صبر کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

Marfat.com

جبر غضب اور قہر کو بھی کہتے ہیں مگر اِنسانی جبر وقہر تو طوعاً و کرہاً برداشت ہو ہی جاتا ہے مگر خدا تعالیٰ کے جبر وقہر کی گرفت نا قابلِ یقین و برداشت ہوتی ہے کیونکہ جبّاری وقہّاری اُس کی صفت ہے اور اس سے بڑا کوئی جبّار اور قہّار نہیں لہٰذا اس کے جبر وقہر سے ہمیشہ ڈرتے رہنا چاہیئے۔ خوفِ خدا رکھنے والے لوگ اسی خوفِ خداوندی سے ہمیشہ ترساں ولرزاں رہتے ہیں مگر قہرِ درویش بر جانِ درویش کے سوا کچھ نہیں البتہ جورِ استاد مہرِ پدر سے بہتر خیال کیا جاتا ہے اور جابر کے سامنے کلمۂ حق کہنا بڑا جہاد متصوّر ہوتا ہے۔

برداشت اور بردباری کو بھی صبر کا نام دیا جاتا ہے اور بربریت اور دہشت گردی کو بھی جبر کہا جاتا ہے۔ جبر سراسر ستم پیشہ ہے اور صبر سراپا مصلحت اندیش ہے۔ جبر نفرت اور بغاوت کو جنم دیتا ہے اور صبر اصلاح اور فلاح کی صلاحیت پیدا کرتا ہے جابر کی جابرانہ حرکات کو جبّارا اپنی جبّارانہ عادات سے برداشت کرتا ہے۔ جبر کی چیرہ دستیاں اور ستمرانیاں جب انتہا کو پہنچ جاتی ہیں تو صبر کا دامن ہاتھ سے چھوٹ کر اپنا رنگ خوب دکھاتا اور جماتا ہے۔ صبر کا یارا جبر کی استحصالی قوت کا ایسا منہ توڑ جواب دیتا ہے کہ جبر اپنی موت آپ مر جاتا ہے۔ جبر بے چینی اور بدامنی کی راہ ہے اور صبر امن وسلامتی کا راستہ ہے۔ جبر ہمیشہ سرنگوں ہوتا ہے اور صبر سرفراز ہوتا ہے۔

آجر اجیر سے جبراً کام لیتا ہے جسے اجیر جبراً و قہراً کرتا ہے اور صابر جب صبر کی سل چھاتی پر رکھ لیتا ہے تو اس کا صبر جابر کی جان پر پڑتا بلکہ ٹوٹ پڑتا ہے اور جب صابر کو صبر کا یارا نہیں رہتا تو وہ صبر کر کے بیٹھ جاتا ہے۔

صبر ضبطِ نفس اور شکیبائی کا نام ہے اس سے سکون واطمینان ملتا ہے اور جابر پر خدا کی مار کا سبب بنتا ہے۔

جبر کو بے شمار قسموں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً معاشی اور معاشرتی جبر، سماجی اور اخلاقی جبر، حکومتی اور حکمرانی جبر وغیرہ ـــــــ حکومتی جبر گوناگوں ہوتا ہے جیسے قلم بندی، زبان بندی، نظر بندی، خانہ بندی، جبری ٹیکس اور جبری بھرتی وغیرہ۔ مگر

صبر کی دو اعلیٰ اِقسام بھی ہیں ایک صبرِ ایوبؑ جو انتہائی مشہور صبر ہے اور دوسرا صبرِ جمیل جس پر ثواب ملتا ہے۔ فارسی میں اس کی ایک مشہور ضرب المثل ''صبر گرچہ تلخ است ولے برشیریں دارد'' ہے یعنی صبر اگرچہ ناگوار ہے مگر اس کا انجام بہت اچھا ہوتا ہے۔ اور اُردو

Marfat.com

میں اس کی مشہور ضرب المثل ''صبر کی داد خدا کے ہاتھ'' ہے یعنی صابر کا اِنصاف خود خدا ہی کرتا ہے اور صبر آزما لمحات میں اس کی توفیق بھی خدا تعالیٰ ہی عطا کرتا ہے اور اپنے صفاتی نام ''صبور'' کے طفیل گناہگاروں پر نرمی کرتا ہے۔

بلاشبہ صبر سب سے بڑی دعا ہے، ہر درد کی دعا ہے اور ایک وصفِ خاص ہے مگر بے صبری فطری کمزوری ہے جو حصولِ مقصد کی بے تابی سے عبارت ہے جس سے حرص و ہوا کی شدّت ظاہر ہو کر اِنسان کو بے اطمینانی اور بے سکونی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا اور وہ یہ حقیقت فراموش کر بیٹھتا ہے کہ جو مقدور و مقسوم ہوتا ہے وہ اسے وقت پر مل ہی جاتا ہے۔

حاصل کلام یہ کہ جور و جبر سے خدا کا خوف کیجئے اور جب کوئی آپ پر جبر کرے تو صبر کو شعار بنائیے اور اس پنجابی مثل پر عمل کیجئے ''صبر شکر درگا ہے لیکھا'' اور ارشادِ ربّانی اور فرمانِ رسول ﷺ کو پیشِ نظر رکھیئے کہ

"اِنَّا اللّٰہَ مَعَ الصَّابِرِین"

اَلصَّبْرُ مِفْتَاحُ الْفَرَح

Marfat.com

جدائی اور موت

جدائی رفاقت کی ضد ہے اور موت حیات کی ضد۔ جدائی دوری اور تنہائی ہے اور موت ختم ہو جانے کا نام ہے۔ جدائی تڑپاتی اور رلاتی ہے اور موت مٹا کر خاک میں ملا دیتی ہے جدائی میں صبر و قرار نہیں آتا۔ دوست احباب ناصح بن کر صبر کی تلقین کرتے ہیں اور موت پر آنسو بہانے والوں کو اعزا و اقارب یوں دلاسے دیتے ہیں کہ موت سے مفر نہیں۔ یہ اٹل ہے۔ یہ امرِ ربی ہے۔ ''مرضی مولا از ہمہ اولیٰ'' کے بمصداق رضائے ربی کو ماننے بنا کوئی چارہ نہیں۔ مرحوم کے لئے دعائے مغفرت کی ضرورت ہے یوں لواحقین کو یہ حقیقت جان کر صبر آجاتا ہے اور وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ رنج و غم کے زخم مندمل ہو جاتے ہیں مگر

عالم جدائی میں کوئی نصیحت، کوئی تلقین اور کوئی دلاسا کام نہیں آتا۔ بہی خواہوں اور غمگساروں کی تمام ہمدردیاں دھری کی دھری رہ جاتی ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی شدت میں کمی کے بجائے مسلسل اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اس کا کوئی چارہ اور علاج نہیں مگر اسیر جدائی اس اسیرِ قفس کی طرح ہوتا ہے جو پنجرے میں پھڑ پھڑاتا رہتا ہے اور اُڑنے کے لئے تڑپتا ہے مگر قید و بند کی صعوبتوں سے نجات نہیں پا سکتا۔ بالآخر وہ تنگ آجاتا ہے اور اس قیدِ تنہائی کا خود ہی مداوا تجویز کرتے ہوئے یوں گویا ہوتا ہے کہ

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں یار ناصح
ارے کوئی غمگسار ہوتا کوئی چارہ ساز ہوتا

پھر تلملا کر دیدارِ یار کے واحد علاج کی نشاندہی کرتے ہوئے پکار اٹھتا ہے کہ

از سرِ بالین من برخیز اے ناداں طبیب
درد مند عشق را دارو بجز دیدار نیست

کہتے ہیں کہ جدائی (ہجر و فراق) عاشق کی موت ہے۔ میں کہتا ہوں کہ موت سے بدتر ہے کیونکہ وصال یار اس کے مقدر میں نہیں ہوتا اور وہ فراق سے کبھی چھٹکارہ نہیں پا سکتا جبکہ

Marfat.com

موت اِنسان کو قیدِ حیات سے رہائی دلا کر غم و آلام زندگی سے نجات کا ذریعہ بنتی ہے۔

موت کے دو پہلو ہیں ــــــ جدائی اور ملاپ ــــــ

موت کا ایک پہلو تو یہ ہے کہ اِنسان دنیا والوں اور دنیاوی زندگی سے جدا ہو جاتا ہے اور خود دو حصّوں میں بٹ جاتا ہے ــــــ جسدِ خاکی اور روح ــــــ جسدِ خاکی روح سے بچھڑ کر اپنی اصل (خاک) میں جا ملتا ہے اور روح جسدِ خاکی سے جدا ہو کر اپنی اصل (عالم ارواح) میں جا ملتی ہے۔ مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ موت جسم اور روح کی جدائی کا نام ہے۔

جدائی الگ ہونے اور بچھڑ جانے کی کیفیّت کا نام ہے یہ کیفیّت بڑی جانگسل اور نا قابلِ برداشت ہوتی ہے۔ اس کے متحمل ہونے کا کسی کو یارا نہیں۔ یہ ایک گھن کی طرح اِنسان کو اندر سے کھوکھلا کر دیتی ہے اور زندگی کو اجیرن اور دوبھر بنا ڈالتی ہے۔ خدا کسی کو اس جان لیوا کیفیّت سے دوچار نہ کرے کیونکہ یہ کیفیّت جیتے جی مار دیتی ہے اور مار مار کر یوں زندہ رکھتی ہے کہ اس کا شمار نہ زندوں میں رہ جاتا اور نہ مردوں میں۔ دعا ہے کہ خدا کرے کہ کبھی کسی کا یار نہ بچھڑے۔

جدائی میں تنہائی کا غالب احساس شدید رنج و کرب کا باعث بنتا ہے جس سے چھٹکارہ پانا ناممکن امر ہے اس کے صبر آزما لمحات کاٹے نہیں کٹتے۔ کوئی کوشش بر نہیں آتی اور اس کے خاتمے کی کوئی صورت نہیں بن پڑتی۔ لاچاری اور بے بسی حد سے بڑھ جاتی ہے اور اس کی قوت برداشت جواب دے جاتی ہے اور بالآخر اِنسان گھل گھل کر موت کی آغوش میں ابدی نیند سو جاتا ہے۔

اب تک کا جدائی کا ذکر ہجرِ یار تک محدود نہ سمجھیں جو ایک مہجور کو موت کے منہ میں جھونک کر گوشۂ لحد تک پہنچا دیتا ہے مگر اسکے سوا جدائی کے اور بھی کوئی روپ ہیں جن سے اِنسان کو اپنی حیاتِ مستعار میں واسطہ و سابقہ پڑتا ہے جن سے انسان کو مقابلہ کرنے یا سہنے کی ضرورت پڑتی ہے۔

جس طرح شاخ درخت سے جُدا ہو کر سوکھ جاتی ہے اور پتّا شاخ سے جدا ہو کر مرجھا جاتا ہے بعینہٖ ایک اِنسان اپنے خاندان سے کٹ کر یا معاشرہ سے الگ ہو کر زندگی کے دن نہیں گزار سکتا۔ اس کی مثال ماہیٔ بے آب کی سی ہے جو سمندر سے الگ ہو کر تڑپ تڑپ کر اور سسک سسک کر جان سے ہاتھ دھو بیٹھتی ہے یا ڈار سے بچھڑے پرندہ کے مانند ہے جو یکّہ و تنہا سرگردانی کے عالم میں پھڑ پھڑاتا اور اُڑتے اُڑتے تھک ہار کر زمین پر گر پڑتا ہے اور دم توڑ دیتا ہے پس ثابت ہوا کہ اِنسان کی کامیاب زندگی کا راز ملاپ اور یکجہتی میں ہے جدائی اور تنہائی میں نہیں۔

Marfat.com

قبیلہ ہو یا قوم، فرد ہو یا خاندان، جماعت ہو یا انجمن ان کی باہمی وابستگی اور ہم آہنگی اتفاق واتحاد کو فروغ دیتی ہے اور مقاصد حیات کو پانے کی ضمانت فراہم کرتی ہے بقول اقبالؒ:

وابستہ رہ شجر سے اُمیدِ بہار رکھ

اوران کے باہمی تنازعات واختلافات دوری، جدائی اور تنہائی کا باعث بنتے ہیں اور وہ فرمودۂ اقبالؒ کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھتے کہ

موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

خاندان اور قبائل جب ایک دوسرے سے جدا ہوتے ہیں تو بکھر کر کمزور ہو جاتے ہیں جبکہ ملکی اور علاقائی علیحدگی نئی ریاستوں اور حکومتوں کو جنم دیتی ہے جن کا پھر سے ایک ہونا ناممکن ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک جماعت کو چھوڑ دینا یا اس سے الگ ہو کر دوسری جماعت میں جا ملنا یا اپنی جدا تنظیم قائم کر لینا ایک سیاسی مشغلہ سمجھا جاتا ہے کیونکہ ان کی علیحدگی اور ملاپ ایک شاطرانہ چال ہوتی ہے جو ذاتی مفادات کے لئے چلی جاتی ہے۔ ایسا کرنے سے مقبولیت اور کامیابی کا چانس بھی ہوتا ہے اور نفرت و ناکامی کا بھی۔ بہرحال یہ فعل مقبول بھی متصوّر ہوتا ہے اور نامقبول بھی۔

نتیجتاً ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جدائی اور ملاپ، علیحدگی اور اشتراک، نفاق اور اتحاد کی بنیاد اختلافات اور مفادات ہوتے ہیں جو نظریۂ ضرورت کے تحت صورت پزیر ہوتے ہیں اور ان کی نوعیّت وقتی اور عارضی بھی ہوتی ہے اور مستقل بھی۔

ہجر اور وصل اور جدائی اور ملاپ کے اس ذکر سے جو مثبت اور منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں ان کا اندازہ دونوں کیفیتوں کے متاثرین بخوبی جانتے مگر میں تو اس عقیدہ کا قائل ہوں کہ

"ناخن گوشت سے کبھی جدا نہیں ہوتے"

Marfat.com

جمہور اور جمہوریت

جمہور اور جمہوریت عربی الفاظ ہیں۔ جمہور کے لغوی معنی ریت کا ٹیلہ یا ریت کا ڈھیر ہے۔عمومی طور پر اس سے مراد عوام یعنی سب لوگ لی جاتی ہے اور جمہوریت جمہور (عوام) کا طرزِ حکومت ہے۔

جمہوریت جمہور کا اپنا تخلیق کردہ نظام ہے جس میں عوام اور ریاست کے مابین حقوق و فرائض کا تعین کیا جاتا ہے۔ ووٹ دینے اور رائے کے اظہار کی آزادی ہوتی ہے۔ پارلیمنٹ کی خودمختاری اور آئین کی بالادستی ہوتی ہے۔ ان خصوصیات کی بنا پر سیاسی رواداری کا تاثر اُبھرتا ہے۔ کیونکہ عوام کا یہ اپنا طرزِ حکومت خود اپنے لئے ہوتا ہے۔ اس میں غیروں کا عمل دخل قطعاً نہیں ہوتا مگر افسوس کہ دیکھنے میں یہی آیا ہے کہ اس دھرتی میں جمہور کی کوئی اوقات نہیں اور اسے کیڑے مکوڑوں سے زیادہ اہمیّت نہیں دی جاتی۔ ہمارے وطنِ عزیز میں عملاً اس کو پنپنے اور فروغ پانے کا موقع نہیں ملا کیونکہ کوتاہ اندیش اور اقتدار کے بھوکے سیاستدانوں اور فوجی آمروں نے اس کے ثمراتِ شیریں سے کما حقہ مستفید ہونے کی عوام کو مہلت ہی نہیں دی۔

باوجود اس کے کہ آج کا دور جمہوریت کا دور ہے۔ ہر چھوٹے بڑے ملک میں اس کے شعور کا ادراک موجود ہے مگر کہیں بھی اسکی صحیح قدروں کی پاسداری دیکھنے کو نہیں ملتی۔ سیاستدانوں کے ذاتی مفادات نے عوام کو یرغمال اور جمہوریت کو اپاہج بنا کر رکھ دیا ہے۔ جمہوریت کے پودے کی صحیح معنوں میں آبیاری نہیں کی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ یہ شجر سایہ دار ہونے کے بجائے خزاں زدہ ہو کر بے سایہ سا ہو کر رہ گیا ہے۔ اربابِ اختیار اپنے فرائض منصبی دیانت اور جانفشانی سے ادا نہیں کرتے۔ وہ ہمیشہ مفادات کی جنگ جیتنے کی فکر میں لگے رہتے ہیں چاہے انکے مقاصد کے حصول کی تگ و دو میں جمہوریت کی اقدار پائمال ہوں یا اسکی بساط تک الٹ جائے۔

پاکستان کے حصول کا مقصد بقول قائدِ اعظمؒ "ایک اِسلامی نظریاتی فلاحی مملکت" کا قیام تھا۔ نظریہ توحید پر حاصل کی گئی اِس مملکت میں جب تک اس میں اِسلامی تصوّرات اور اس کے

Marfat.com

اصول وقوانین کی عملداری نہ ہو وہ کیسے ایک فلاحی مملکت بن سکتی ہے؟ ضرروت اس امر کی تھی کہ پیغمبرِ اِسلام ﷺ کی تعلیمات کا مکمل نفاذ ہو اور جمہور اپنے تئیں اِسلامی ڈھانچے میں ڈھالیں اور انفرادی اور مجموعی نقائص کی اِصلاح کریں اور جمہوریت کے بدن میں داخل امراض کا علاج کریں مگر افسوس کہ ہم نے اپنی کوتاہ اندیشی اور مفاد پرستی کی خاطر جمہوریت کی اصلیّت وحقیقت سے بے نیاز ہو کر اسے محض ایک کھلونا بنا کر رکھ دیا ہے۔ ہوس اقتدار میں منتخب اور آئینی حکومت کا آن واحد میں تختہ اُلٹ کر رکھ دینا عوام کے فنِ حاکمیت کی توہین ہے۔ جمہوریت کی روح کا قتل ہے۔ بنیادی حقوق کا استحصال ہے۔ جبر واستبداد ہے۔ ایک آمرانہ حرکت ہے اور ستم بالائے ستم یہ کہ جمہوری اور آئینی اداروں کو غیر جمہوری اور غیر آئینی اداروں میں تبدیل کر کے زیرنگین بنالینا روحِ پاکستان کے سراسر منافی ہے۔ اس آمریت کا کمال ملاحظہ ہو کہ جمہوریت کی دلہن کو آمریت کی چادر میں چھپا چھپا کر حقِ ملکیت کا دعویٰ کیا جاتا ہے اسے ہم آمرانہ جمہوریت کا اگر نام دیں تو بے جا نہ ہوگا کیونکہ قومی اور ملکی سطح کے فیصلے کرنے کا حق واختیار سیاست دانوں کا ہے جبکہ سرحدوں کی پاسبانی اور ملک کا دفاع فوج کی ذمہ داری ہے ضرورت اس بات کی ہے کہ تمام ادارے اپنے آئینی کردار کے پابند رہیں اور ایک دوسرے کے معاملات میں دخل اندازی سے گریز کریں۔ میدانِ سیاست اور میدانِ جنگ دو الگ الگ میدان ہیں۔ میدانِ سیاست کے کھلاڑی جنگی حربوں سے نابلد ہوتے ہیں اور میدانِ جنگ کے جنگجو سیاسی حربوں سے نا آشنا ہوتے ہیں۔ مملکتِ خدا داد کے تحفظ اور اس کی بقا واستحکام ملک وقوم کی بنیادی ضرورت ہے جو ان ہر دو اداروں کے آئینی کردار سے مشروط ہے یعنی جغرافیائی سرحدوں کا دفاع فوج کا کام ہے اور حکمرانی کا حق سیاستدانوں کا۔ دونوں طبقے اگر قومی جذبے سے سرشار ذاتی مفادات سے بالاتر اور غیر ملکی حکمرانوں کے اثر ورسوخ سے بے نیاز ہو کر پوری لگن اور دیانتداری سے اپنے فرائض ادا کریں تو یقیناً بابائے قوم کا خواب پورا ہوگا۔

منتخب جمہوری اداروں کی اکھاڑ پچھاڑ کی ذمہ داری صرف فوجی جرنیلوں کے سر تھوپنا زیادتی کے مترادف ہے کیونکہ اس کے پسِ منظر میں سیاستدانوں کی کوتاہ اندیشی اور نااہلیّت ہی اس کی وجہ دکھائی دیتی ہے جو کسی بھی سبب سے ان کی کوتاہی کی دلیل ہے کہ وہ باہمی محاذ آرائی سے جمہوریت کا تحفّظ کرنے میں ناکام رہے ہیں۔

Marfat.com

اہلِ دانش کو انقلاب کا نقیب سمجھا جاتا ہے ان کا فرض بنتا ہے کہ وہ جمہوریت کے فروغ کے لیے اپنا زورِ قلم استعمال کریں اور جمہوریت کو آمریت سرمایہ داری اور جاگیرداری سے بچانے کے لئے سرتوڑ کوششیں کریں اور جمہوریت کے ارتکاز کو چند ہاتھوں میں محدود رکھنے کے خلاف صدائے احتجاج بلند کریں۔ مغربی اور اِسلامی جمہوریت کے تفاوت کو جمہور کے ذہنوں میں اجاگر کرنے کی سعی فرمائیں۔

میرے نزدیک اصلاحِ احوال کے لئے یوں تو بہت سی چیزوں کی ضرورت ہے تاہم چند تجاویز پیشِ خدمت ہیں جن سے بہتری کی توقع وابستہ کی جاسکتی ہے۔

۱۔ حقیقی جمہوریت کے لئے نت نئے تجربات نہ کئے جائیں۔

۲۔ انتخابات بنیادی دستور کے مطابق عمل میں لائے جائیں۔

۳۔ جمہوریت کو کلیتہً اِسلامی رنگ میں رنگا جائے۔

۴۔ قومی اور وطنی جذبات کو مخلصانہ انداز میں اپنایا جائے۔

۵۔ جمہور کو نہ بے وقوف بنایا جائے اور نہ انہیں نظر انداز کیا جائے

تا کہ

مصوّرِ پاکستان کی جمہوریت سے دلدادگی کے باوصف یہ ثابت نہ ہونے پائے کہ

جمہوریت اک طرزِ حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

Marfat.com

جھڑکی اور دھمکی

جھڑکی اور دھمکی دونوں جڑواں بہنیں ہیں۔جھڑکی چھوٹی اور دھمکی بڑی ہے۔ان کی ماں کا نام طاقت ہے اور باپ کا نام غرور ہے۔انہیں اپنے والدین پر فخر ہے اور یہ دونوں اپنے والدین کی چہیتی اولاد ہیں مگر جھڑکی زبان بندی کا پروانہ ہے اور دھمکی بلیک میلنگ کا مؤثر ہتھیار ہے۔ جھڑکی اگر کارگر ثابت نہ ہو تو نوبت دھمکیوں تک پہنچ جاتی ہے اور اگر دھمکی سے کام نہ بن پڑے تو دھما کے شروع ہو جاتے ہیں جو بڑھتے بڑھتے بڑی مہلک صورت اختیار کر لیتے ہیں۔

جھڑکی اور دھمکی دونوں درحقیقت رعب جمانے کے موثر حربے کے طور پر کام میں لائی جاتی ہیں۔ اِنسان اپنے ہم جنسوں کو مرعوب کرنے، زیرِ اثر لانے، ڈرانے دھمکانے اور محکوم بنانے کے کام آتی ہیں۔ یہ دولت اور سٹیٹس کا سمبل سمجھی جاتی ہیں۔ یہ غرور و تکبّر کی علامت ہیں اور اظہارِ تعلّی کا ذریعہ ہیں۔ صاحبانِ اختیار و قوت انہیں اپنا اِستحقاق تصوّر کرتے ہوئے بروئے کار لاتے ہیں مگر وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ دین، اخلاق اور معاشرہ انہیں ہرگز یہ حق نہیں دیتا۔ جھڑکیوں اور دھمکیوں کے ذریعے سے رعب جمانے والے کو یہ یاد نہیں رہتا کہ وہ بھی اِنسان ہے اور اسے دوسرے اِنسانوں کی یوں تحقیر و تذلیل کا کوئی حق نہیں ہے۔ یہ سراسر غرورِ نفس کا دھوکا ہے، فرعونیت ہے اور فرعون کی عاقبت سے کون آگاہ نہیں۔ جاہ و منصب، قوت و اختیار اور دولت و حکومت آنے جانے والی چیزیں ہیں انہیں قطعاً دوام حاصل نہیں۔ ان اشیاء کے نشے کا خمار اِنسان کو اپنی عاقبت اور انجام سے بے خبر کر دیتا ہے اور یہی اس کی سب سے بڑی بدبختی ہے مگر ان چیزوں کو امانت سمجھنے والے بڑے خوش بخت اور بانصیب ہوتے ہیں جو کسی مرتبے پر پہنچ کر بھی عجز و انکسار اور عدل و انصاف سے کام لیتے ہیں اور عاجز و مسکین اور عادل و منصف بن کر رہتے ہیں۔

جھڑکی اور دھمکی کی حقیقت جاننے کے لئے انہیں اسباب و عمل کے تناظر میں دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ کسی کی احتیاج، ضرورت اور حاجت ان کو سوالی بنا دیتی ہے وہ صاحبِ استطاعت ضرورت مند کی ضرورت پوری کرنے کے لئے اس کے ساتھ تعاون کرنے کے بجائے جھڑک دیتا

Marfat.com

ہے مگر وہ خود اپنی خواہش کو پورا کرنے اور اپنی بات منوانے کی خاطر دوسروں کو طرح طرح کی دھمکیاں دیتا ہے اور تکمیل مدعا کے لئے جبر و جور کے ہتھکنڈوں سے کام لیتا ہے مگر دونوں صورتوں میں جواز کی کوئی وجہ دکھائی نہیں دیتی۔ اگر اِنسان تھوڑی سے عقلمندی اور دور اندیشی سے کام لے اور خود کو دوسروں کی جگہ رکھ کر دیکھے تو اس کی آنکھوں پر نخوت کی بندھی پٹی کے کھلنے کی قوی اُمید ہو سکتی ہے اور وہ جان سکتا ہے کہ کائنات کے مالک و مختار کی کونسی حکمت اس طبقاتی تقسیم میں پوشیدہ ہے۔ یہ اصلاحِ نفس کا راز ہے یہ حقیقت بینی کا درسِ نصیحت ہے اور مقام شکر کا موقع ہے۔ وہ مختارِ کل ہے جس کو جس حال میں چاہے رکھتا ہے اس کے فضل و کرم کے شکرانے میں ضرورت مند کو جھڑکنے اور دھتکارنے کے بجائے اس کی ضرورت کو پورا کرنے میں عافیت ہے اور دیگر اِنسانوں کو زیر اثر لانے اور مقبولیت کا درجہ حاصل کرنے کی خاطر ان کا ڈرانے دھمکانے کے بجائے ان سے برابری کا سلوک روا رکھنے سے شرطِ اِنسانیت بجالانے کے مترادف ہے۔ اور

ہر حال میں بے نیاز اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہنا ہی عبدیت کا تقاضا ہے اور یہی رازِ حقیقت اس امرِ الٰہی میں مخفی ہے: "وامّا السّائل فلا تنهر"۔

Marfat.com

جھوٹ اور سچ

جھوٹ اور سچ ایک دوسرے کی ضِد ہیں۔ جھوٹ میں کھوٹ اور سچ میں صداقت کا عنصر نمایاں ہوتا ہے۔ جھوٹ مکر، فریب، دھوکا اور دغا کے معنوں میں ہوتا ہے۔ جو حقیقت کے برعکس اور واقعہ کے خلاف جھوٹ ہی ہوتا ہے۔ غلط کو بھی جھوٹ ہی کہتے ہیں۔ جھوٹ مذکر بھی ہے اور مونث (پس خوردہ) بھی۔ جھوٹ سراسر گناہ ہے اور سچ سراپا نیکی ہے۔ جھوٹا مردود اور سچا مقبول ہوتا ہے۔ جھوٹے پر خدا کی لعنت برستی ہے اور سچے پر خدا کی رحمت ہوتی ہے۔ سچے کے منہ سے پھول جھڑتے ہیں اور جھوٹے کے منہ سے بدبو آتی ہے۔

جھوٹا ناقص، نقلی، بے ایمان، نکمّے اور بے کار کو بھی کہتے ہیں جیسے ہاتھ کا جھوٹا ہونا۔ جھوٹا کام، جھوٹا کاغذ، جھوٹا وعدہ، جھوٹی قسم، جھوٹی گواہی، جھوٹی زبان، جھوٹی خبر، جھوٹی مہندی وغیرہ وغیرہ۔

مثل مشہور ہے کہ سچ کڑوا ہوتا ہے اور جھوٹ کبھی نہیں پھلتا پھولتا۔ اس حقیقت کو حضرت بابا بلّھے شاہؒ نے ناصحانہ انداز میں بڑی خوبصورتی سے یوں بیان کیا ہے:

سچ آکھیاں بھانبڑ مچدا اے جھوٹ آکھیاں کجھ نہ بچدا اے

بعض جھوٹ سچ لگانے کے عادی ہوتے ہیں اور بعض جھوٹ میں سچ کی آمیزش کو مصلحت گردانتے ہیں اور اپنے جھوٹ کو سچ ثابت کرنے کے لئے فارسی کی یہ ضرب المثل پیش کرتے ہیں کہ "دروغ مصلحت آمیز بہ ز راستیٔ فتنہ انگیز" مگر حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ جھوٹ جھوٹ ہے اور سچ سچ۔ نہ جھوٹ سچ ہوسکتا ہے اور نہ سچ جھوٹ۔ یہ الگ بات ہے کہ وکلاء و خطباء حضرات دلائل و خطابت کے بل بوتے پر سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ ثابت کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگاتے ہیں مگر گوش ہوش اور چشم بینا میں جھوٹ اور سچ کی حقیقت کبھی نہیں چھپ پاتی۔

بعض لوگ جھوٹ کی پوٹ ہوتے ہیں اور ان کو جھوٹ کے پُتلے بھی کہا جاتا ہے جھوٹ ان کی سرشت میں داخل ہوتا ہے وہ ہمیشہ جھوٹ موٹ کہتے رہتے ہیں اور جھوٹی سچی ہانکتے اور

Marfat.com

اُڑاتے رہتے ہیں اسی لئے انہیں جھوٹا، لپاٹی یا جھوٹوں کا بادشاہ کہتے ہیں_____ مگر یہ عجیب بات ہے کہ جھوٹ کی پتلی کو جھوٹ کی رانی یا ملکہ نہیں کہتے بلکہ جھوٹوں کی نانی کہتے ہیں۔لیکن ایسے جھوٹوں کو لوگ پوچھتے تک نہیں کیونکہ وہ اس مقولہ کی صداقت کو جانتے ہیں کہ

''جھوٹے کا منہ کالا، سچ کا بول بالا''۔

کہتے ہیں کہ جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے، مگر جھوٹ کی ناؤ نہیں چلتی اور جھوٹ برابر کوئی پاپ بھی نہیں مگر اس کے باوجود نامعلوم لوگ جھوٹ کے دفتر کیوں کھول لیتے ہیں اور جھوٹ کے پُل کیوں باندھتے ہیں جھوٹ کو جھوٹ جانتے ہوئے بھی جھوٹ کے پُتلے کھڑے کر دیتے ہیں۔ وہ جھوٹ بولتے بھی ہیں۔جھوٹ پکڑتے بھی ہیں جھوٹ لگاتے بھی ہیں۔جھوٹ گھڑتے بھی ہیں۔دوسروں کو بدنام کرنے کے لئے جھوٹ بکتے بھی ہیں مگر سچے ایسے جھوٹوں کے گھر تک بھی جا پہنچتے ہیں۔

ماہرین نفسیات کا کہنا ہے کہ جھوٹ بولنا فطری امر ہے۔ ہر کوئی جھوٹ بولتا ہے۔ بچے اپنی غلطیوں کو چھپانے کے لئے جھوٹ بولتے ہیں اور عورتیں حقیقت کو چھپانے کے لئے قسم کھا کر جھوٹ بولتی ہیں۔ جھوٹ طبقوں، قوموں اور مُلکوں کے مابین نزاع کا باعث بنتا ہے اور بعض اوقات ایسی سنگین صورت اختیار کر جاتا ہے کہ مسئلہ بن جاتا ہے_____ بالخصوص زوجین کے مابین دروغ گوئی کے باعث مسئلہ بڑا گھمبیر اور لاینحل ہو کر رہ جاتا ہے۔ کچھ لوگوں کے بقول اگر اس مسئلے کو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے حوالے کر دیا جائے تو اس کا وجود خطرے میں پڑ جائے گا۔

عورتوں کی دروغ گوئی میں کسی کو کلام نہیں۔اس کی سنگینی کا کون معترف نہیں؟ لیکن ماہرینِ نفسیات نے اس مسئلے کی نزاکت اور پیچیدگی کو بہت حد تک کم کر دیا ہے۔ یورپ کی بعض یونیورسٹیوں نے اس مسئلے کے حل کے لئے باقاعدہ پوسٹمارٹم کا طریقہ اختیار کر کے رپورٹ ترتیب دی ہے اس کے مطابق

(۱) عورتیں ابتدائی عمر ہی سے دروغ گوئی کی جانب مائل ہو جاتی ہیں۔

(۲) ڈاکٹر بلیک فارلین کے خیال کے مطابق لڑکیاں 4/5 سال کی عمر ہی سے دروغ گوئی کا فن سیکھ لیتی ہیں جبکہ لڑکے 6/7 سال کی عمر میں جھوٹ بولنا شروع کرتے ہیں۔ان کی رائے میں لڑکوں کے مقابلے میں لڑکیوں کو اس فن میں سبقت حاصل ہے۔

(۳) وی آنا یونیورسٹی کے شعبۂ نفسیات نے ثابت کیا ہے کہ عورتیں دروغ گوئی کے مقابلے میں

Marfat.com

زبردست فطری صلاحیتوں کی مالک ہوتی ہیں۔ وہ اس سنجیدگی، سلیقے، اور خوبصورتی سے جھوٹ بولتی ہیں کہ سننے والے آنکھ بند کر کے قبول کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

(۴) جب کوئی مرد جھوٹ بولتا ہے تو اس کا چہرہ متغیر ہو جاتا ہے اور وہ نروس دکھائی دیتا ہے مگر جب کوئی عورت جھوٹ بولتی ہے تو اس کے چہرے پر کوئی نمایاں کیفیت نہیں اُبھرتی۔ وہ اس اعتبار سے جھوٹ بولتی ہے کہ وہ بالکل سچ معلوم ہوتا ہے۔

(۵) عورت مرد کو جھوٹ بولنے پر مجبور کرتی ہے۔

(۶) بقول مس لارسن عورتیں دروغ گوئی سے اس لئے کام لیتی ہیں تا کہ وہ چاہی جائیں۔

(۷) عورتیں نسوانی انا اور فطری کمزوریوں کے باعث جھوٹ بولنے پر مجبور ہوتی ہیں ان میں سچ بول کر حقائق کی ٹھوس اور ناخوشگوار تلخیوں سے مقابلہ کرنے کی سکت نہیں ہوتی۔ وہ تفصیلات میں جانے سے گریز کرتی ہیں اور اس بات سے بھی بے پروا ہوتی ہیں کہ جھوٹ کے نتائج کس قسم کے ہوں گے۔

واقعی زیب و زینت، تزئین و آرائش، بناؤ سنگھار اور تصنع پسندی سے عورت کا فطری لگاؤ اس بات کا غماز ہے کہ یہ سب اس کے جھوٹے کام ہیں۔ وہ ہمیشہ اپنی عمر بتانے کے لئے جھوٹ بولتی ہے۔ وہ کمزور اور شکی مزاج ہے اور یوں وہ اپنی کمزوریوں اور حقیقتوں کو چھپانے کے لئے ہمیشہ جھوٹ کا سہارا لیتی ہے۔ داناؤں کا یہ قول جھوٹ تو نہیں ہے کہ ''زن، زر اور زمین تینوں فتنے ہیں'' بلکہ یہ کہنا اور سمجھنا چاہیئے کہ جھوٹ فتنہ ہے، شر ہے، نزاع ہے، جنگ ہے۔ جھوٹ کو منہ نہیں لگانا چاہیئے بلکہ اس سے منہ پھیر لینا چاہیئے۔

اب اگر سیاستدانوں کی کارکردگیوں کے پسِ منظر میں ان کی جبلّت اور خصلت کی لَو ہ لگائی جائے تو یہی حقیقت راضح ہو جاتی ہے کہ جھوٹ ان کی گھٹی میں شامل ہے۔ اس کے بغیر ان کی سیاسی شخصیت اجاگر نہیں ہوتی۔ جھوٹ کے ہتھیار اور حربہ سے ہی ان کی صلاحیتیں اُبھرتی ہیں اور جِلا پاتی ہیں۔ جھوٹ کے نسخۂ کیمیا کے مسلسل استعمال سے ان کی قوتِ کار میں اضافہ ہوتا ہے جس کے بل بوتے پر وہ ہمیشہ کامیابیوں اور کامرانیوں سے ہمکنار ہوتے ہیں۔ وہ اپنے جھوٹے وعدوں اور نعروں سے عوام کو خوب اُلّو بناتے ہیں اور عوام ہیں کہ ان کے جھانسے میں آ کر ان کی داد و تحسین کے لئے اپنے دیدہ و دِل کو فرشِ راہ بنا دیتے ہیں۔ جھوٹ ان کے نزدیک وقت کی اہم ضرورت

Marfat.com

ہے۔نہ صرف بوقتِ ضرورت بلکہ بغیر ضرورت کے بھی اس کا استعمال قلب وذہن کے لئے باعثِ سکون وراحت ہے۔سچ تو یہ ہے کہ میدانِ سیاست جھوٹ کی سج دھج کا ہی مرہونِ منّت ہے۔

جھوٹ اور سیاست کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔جھوٹ کے سیاست پر اور سیاست کے جھوٹ پر اثرات بڑے گہرے اور سحر انگیز ہوتے ہیں اور ان کے حیرت انگیز نتائج وفوائد برآمد ہوتے ہیں۔جھوٹ سے سیاست چمکتی ہے اور سیاست سے جھوٹ کو فروغ ملتا ہے۔سیاستدان جھوٹ کو عبادت سمجھتے ہیں مگر حقیقت میں یہ طالع آزمائی ہے مخاصمت کا رجحان ہے۔دشمنوں اور رنجشوں کی زہریلی غذا ہے اور یہ انتقام کی بنیاد پر استوار ہوتی ہے۔جھوٹ بولتے وقت ان کے چہروں پر شرم کے آثار تک دکھائی نہیں دیتے وہ اپنے چہروں پر ایسے ایسے کئی چہرے بنا لیتے ہیں کہ ان کے حواری ان کے جھوٹ کو فرحت زا اور راحت افزا سمجھتے ہوئے تالیاں بجاتے ہیں اور خوش ہوکر ناچنے لگ جاتے ہیں مگر حقیقت آشنا لوگ ان کے جھوٹ کا پول بڑے حسین انداز میں یوں کھولتے ہیں کہ ان کے جھوٹ سے خود جھوٹ اپنا منہ چھپاتا ہے اور شرم خود شرم سار ہو جاتی ہے۔

سیاستدانوں کی دروغ گوئی اور غلط بیانی کا اگر عورتوں سے مقابلہ وموازنہ کیا جائے تو نہلے پہ دہلے کا تاثر ملتا ہے۔عورتوں کی دروغ گوئی میں یک رنگی پائی جاتی ہے جبکہ سیاسی بیان بازی میں ہمہ رنگی ہوتی ہے۔سیاست دان گرگٹ کی طرح رنگ بدلنے میں بدطولیٰ رکھتے ہیں فرمان خداوندی ہے کہ جَاءَ الحَقُّ وَ زَھَقَ البَاطِل اِنَّ البَاطِلَ کَانَ زَھُوقَا (سچ آیا اور جھوٹ گیا۔بے شک جھوٹ جانے ہی والا ہے) اس لئے سچ اور جھوٹ کا اتحاد اور ملاپ ممکن نہیں۔اگر دونوں کو ملایا جائے تو یہ اُلٹی سیدھی بات ہے۔"دروغ آمیز راستی" یا "دروغِ مصلحت آمیز" _____ دونوں بناوٹی کہاوتیں ہیں۔دونوں کا مفہوم ایک ہی ہے اور وہ جھوٹ ہے، سچ نہیں۔جھوٹ جھوٹ ہی ہے سچ کے ساتھ اِس کا آمیزہ یا مرکب اس میں مٹھاس پیدا نہیں کرسکتا۔دروغِ مصلحت آمیز کی حقیقت وہی ہے جو بھوک میں خنزیر کھانے کی یا بیماری میں شراب پینے کی۔جس طرح حرام میں شفا نہیں اسی طرح جھوٹ میں مصلحت پیدا نہیں ہوسکتی اور اگر بزرگ کہیں کہ "دروغ آمیز مصلحت" سچ ہے تو یہ ان کا سچ ہے۔یہ ان کی سوچ ہے، عقل ہے، حکمت ہے، دانائی ہے۔یہ ان کا معاملہ ہے۔ممکن ہے کہ ان کے نزدیک اس کا کوئی جواز ہو لیکن ہر کسی کے بس کا یہ روگ نہیں کیونکہ ہر کوئی اس کے استعمال سے سچا یا بزرگ نہیں بن سکتا۔سچ تو یہ ہے کہ "جس کا کام اسی کو ساجھے اور کرے تو

Marfat.com

ڈھینگا باجے"

سچ پانی اور جھوٹ آگ ہے۔آگ اور پانی کا کیا جوڑ؟ایک وقت میں آگ جلے گی یا پانی بہے گا۔اگر یہ حقیقت ہے کہ جھوٹ کی آگ کو سچ کا پانی سرد کر سکتا ہے تو یہ بھی سچ ہے کہ جھوٹ سچ میں آگ بھی لگا سکتا ہے۔

آج سچ کا زمانہ نہیں۔جھوٹ کا دور دورہ ہے۔سچ کہنے والا پھنس جاتا ہے اور جھوٹ کہنے والا چھوٹ جاتا ہے۔بقولِ حالی:

ہم نہ کہتے تھے کہ حالی چپ رہو　　راست گوئی میں ہے رسوائی بہت

ہر شخص جھوٹ بولتا ہے باسی چیزوں کو تازہ، ناخالص کو خالص، نقلی کو اصلی، بے کار کو کار آمد، غیر مفید کو فائدہ مند، گدھے کے گوشت کو موٹے بکرے اور کُتّے کے گوشت کو پہاڑی بکرے کا گوشت کہہ کر بیچا جاتا ہے۔اکیڈیمیاں سو فیصد کامیابی کے بورڈ لگا کر طالب علموں کو ٹیوشن کے لئے پھانستی ہیں۔عطائی ڈاکٹر شرطیہ علاج کا جھانسہ دیتے ہیں۔ڈرائیور نان سٹاپ کہہ کر مسافروں کو خوار کرتے ہیں۔اِنسانی سمگلنگ کے دھندہ کو بیرونِ مُلک پُرکشش ملازمت کی ضمانت دے کر فروغ دیا جاتا ہے۔خوبرو لڑکیوں کو ماڈل گرلز یا سٹیج فنکارہ بنانے کا لالچ دے کر انہیں کافرانہ چالوں سے گناہ کے دلدل میں پھینکا جاتا ہے۔غرض ہر شعبہ حیات اور ہر کاروبار میں جھوٹ کے کھوٹے سِکّوں سے دولت کمانے اور ہتھیانے کے کامیاب حربوں سے کام لیا جاتا ہے مگر میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ یہ لوگ پیسے کی خاطر اپنا نامۂ اعمال کیوں سیاہ کرتے ہیں؟

آج کی دُنیا سائنس کی دنیا ہے آج کا دور دلائل کا دور ہے۔مشاہدات و تجربات اور دلائل و براہین سے سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ ثابت کیا جاتا ہے۔اگر وقت کے ساتھ ساتھ چلنا ہے۔زمانے کا ساتھ دینا ہے۔اس دنیا میں رہنا ہے۔مادہ پرستی کی دوڑ میں حِصّہ لینا ہے اور کامیاب زندگی گزارنا ہے تو پھر جھوٹ سچ کو ملا کر کام میں لانا پڑے گا سچ کی تکذیب اور جھوٹ کی تصدیق کرنا پڑے گی۔سچ کی اقدار کو پامال کر کے جھوٹ کا بول بالا کرنا پڑے گا۔عصری تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے اور وقتی مفادات کی خاطر سچ اور جھوٹ کو بطور ایک ہتھیار استعمال کرنا پڑے گا۔سچ اور جھوٹ کو ہاتھی کے دانت کہنا پڑے گا جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ "ہاتھی کے دانت دکھانے کے اور، کھانے کے اور" _____ بس کامیاب زندگی کا گُر درحقیقت جھوٹ اور سچ کے ملے

Marfat.com

جلے گُروں کا نام ہے _____ دونوں حیلے بہانے ہیں، حربے ہیں، گُر ہیں اگر یقین نہ آئے تو سیاستدانوں سے جا کر پوچھ لیجئے، ان سے سیکھ لیجئے یا پھر ان کے قول و فعل، گفت و شنید اور حرکات و بیانات سے اس امر کی تصدیق کر لیجئے یا وکلاء حضرات کے زور خطابت کے دلائل سے جان جایئے اور مان لیجئے کہ سچ مچ آج کا زمانہ سچ کا زمانہ نہیں رہا اور جھوٹ ہی وہ سچ ہے جس کے بغیر کوئی شخص سچا دکھائی ہی نہیں دیتا۔

سچ کے وہ زمانے لد گئے جب کہا کرتے تھے کہ "سچ حق ہے"۔ "سانچ کو آنچ نہیں"۔ "سچ کا بول بالا ہوتا ہے"۔ "سچ کہہ سکھی رہ"۔ "سچ کہنا آدھی لڑائی مول لینا ہے" وغیرہ وغیرہ _____ آج کل تو یہ باتیں بے معنی ہو کر رہ گئی ہیں۔ ان کی جگہ اب نئی کہاوتیں آ گئی ہیں۔ مثلاً "سچ کہنا اور دکھی رہنا"۔ "سچ کہنا پوری لڑائی مول لینا ہے"۔ "سچا جائے روتا آئے، جھوٹا جائے ہنستا آئے" _____ اگر یقین نہ آئے تو آزما کر دیکھ لیجئے _____ مگر اس کے باوجود ان حقائق کو تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں کہ

۱) جیت ہمیشہ سچ کی ہوتی ہے اور ہار جھوٹ فریب کا مقدر رہے۔
۲) سچ کبھی نہیں ہارتا اور جھوٹ کبھی نہیں جیتتا۔
۳) سچ میں سکون ہے اور اطمینان ہے اور جھوٹ میں بے سکونی اور بے اطمینانی ہے۔
۴) ہمیشہ سچ بولو کیونکہ یہ آخرت میں بھی کام آتا ہے۔
۵) جھوٹ بولنا اور سچ کو چھپانا سراسر فریب اور دھوکا ہے۔
۶) جھوٹ سے بچو کیونکہ یہ دنیا کی سب سے بڑی لعنت ہے۔
۷) جھوٹ سب گناہوں کی ماں ہے۔
۸) جان بچانے کے لئے جھوٹ بولنا جائز ہے۔

میرے جھوٹ سچ کے اس تذکرے سے اگر کسی قاری کو تکلیف پہنچی ہو تو میں معافی کا خواستگار ہوں اور جھوٹ سے توبہ کرتا ہوں کیونکہ بموجب فرمانِ رسول ﷺ:

۱) ایک جھوٹ سے اگر توبہ کر لی جائے تو تمام گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔
۲) مسلمان کی تعریف یہی ہے کہ وہ کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔

Marfat.com

چالاکی اور چاپلوسی

چالاکی اور چاپلوسی دو جڑواں بہنیں ہیں۔ چوری اور چغل خوری بھی جڑواں ہیں جبکہ عیاری ان کی بڑی بہن ہے۔ پانچوں سرشت وخو میں ایک مگر سیرت وکردار میں ایک دوسری سے مختلف ہیں۔ ہر ایک کا طرزِ عمل جداگانہ ہے مگر مقصد ایک ہی ہوتا ہے _____ مطلب برآری _____ منافرت، فریب دہی، تہمت بندی، الزام تراشی، کردار کشی، عصیاں کاری، کرپشن، رشوت خوری اور وعدہ خلافی وغیرہ کا شمار ان کی آل اولاد میں ہوتا ہے۔ بن ماں باپ کے اس تانیثی خاندان کی انفرادیت یہ ہے کہ اس کی کوئی نرینہ اولاد نہیں۔

چالاکی میں چالبازی، چاپلوسی میں خوشامد، چغل خوری میں غیبت چوری میں پوشیدگی اور عیاری میں ہوشیاری کام آتی ہے۔ چالاکی میں ذہانت، چاپلوسی میں مسکینی، چغل خوری میں تنہائی اور عیاری میں تیزی وطراری کی ضرورت ہوتی ہے مگر چوری چھپ چھپا کر کی جاتی ہے مگر یہ الگ بات ہے کہ اگر چوری میں سینہ زوری سے کام لیا جائے تو یہ ڈکیتی کا روپ دھار لیتی ہے۔ _____ ان سب کی وارداتیں ضرورت اور موقع محل کے مطابق ہوتی ہیں۔ مگر شارٹ کٹ لگا کر جلد مقصد کو پانا عیاری کا کمال ہے۔

یاد رہے کہ چوری پکڑی جانے پر چور چترائی سے کام لیتا ہے اور اگر وہ سزا یا ندامت کے باعث چوری سے توبہ بھی کرے تو پھر بھی وہ ہیرا پھیری سے باز نہیں رہ سکتا۔ اور ہاں یہ بھی سچ ہی ہے کہ کسی چور کو کوئی چور ہی پکڑ سکتا ہے مگر عجب بات تو یہ ہے کہ چوری کے گُر کو سب میٹھا سمجھتے ہیں۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ چور کے پاؤں نہیں ہوتے۔ اگر نہیں ہوتے تو پھر وہ چوری کرنے کے لئے کس کے سہارے چل کر آتا ہے اور کس کے بل بوتے پر بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوتا ہے مگر یہ ضرور ماننا پڑتا ہے کہ چور بزدل ہوتا ہے جبکہ ڈکیٹ دلیر ہوتا ہے۔

چونکہ ان سب کی نسل اور جنس ایک ہی ہے اسلئے انکا مقصد حیات اور مطمع نظر بھی صرف اور صرف مطلب برآری ہے جس کیلئے انکے طرزِ طریق اور اندازِ کار الگ الگ ہیں۔ اگرچہ ان سب کا خانوادہ تانیثی اسمائے صفات سے متعلق ہے مگر یہ "صفات" ذکور میں بھی درآتی ہیں اسلئے تمام

Marfat.com

اناث وذکوران "صفات" سے متصف ہیں مگر یہ الگ اور مسلّمہ حقیقت ہے کہ انکا شمار صفات میں نہیں بلکہ ذمائم میں ہے مگر باوجود اسکے کہ اسلام نے ان ذمائم سے بچنے کیلئے ہر چند تلقین فرمائی ہے اور مکروفریب، چالاکی وچالبازی، چغلی وچاپلوسی اور چوری چکاری سے تکمیل خواہش سے باز رہنے کی تاکید کی ہے _____ اور چغلی کھانے کوتو اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھانے سے تعبیر کیا ہے اور دیگر ذمائم کی تعزیروں سے ڈرایا ہے مگر افسوس کہ دنیا طلبی کی سفلی خواہشات اِنسانی فطرت کو مہمیز لگا کر ہمیں گنہگار بنادیتی ہیں۔ دعا ہے کہ خدا تعالیٰ ہمیں ان ذمائم سے بچنے کی توفیق عطا فرمائے۔

ان ذمائم کے پسِ منظر میں اگر دنیا کے لوگوں کی طبقاتی تقسیم کی جائے تو رذائل واشراف کے دو طبقے بنتے ہیں۔ طبقہ اوّل میں چالاک، چاپلوس، چغل خور، چور، ڈاکو، فریبی، دغا باز اور مکّار وعیّار آتے ہیں اور طبقہ ثانی میں شریف، معصوم اور بھولے بھالے لوگوں کا شمار ہوتا ہے جو ہمیشہ اپنے طبعی خصائص کی بنا پر طبقۂ اوّل کا شکار بنتے ہیں۔ بعض ہنرمندوں، قلمکاروں اور سیاستدانوں کا شمار ان کے کالے کرتوں کی وجہ سے طبقۂ اوّل میں ہوتا ہے جبکہ شریفوں، بچوں، عورتوں اور سکول ماسٹروں کا شمار طبقۂ ثانی میں ہوتا ہے۔

طبقۂ اوّل کے لوگ گرگٹ کی طرح لحہ بہ لحہ اپنا رنگ بدلتے رہتے ہیں کیونکہ انہیں اپنی وارداتوں کے لئے بہت کم وقت ملتا ہے اس لئے انہیں پھرتی، چُستی اور ہوشیاری سے کام لینا پڑتا ہے تاکہ مطلوبہ مقاصد حاصل کرنے میں کامیاب ہوسکیں جبکہ طبقۂ ثانی کے لوگوں کے پاس وافر وقت ہوتا ہے _____ بلکہ وقت ہی وقت ہوتا ہے _____ اور وہ بے وقت اپنی سادہ لوحی اور شرافت کے باعث طبقۂ اوّل کے جھانسے میں آکر ہمیشہ لٹتے رہتے ہیں۔ مگر

عاشقانِ دلگیر اپنے محبوب کی ناز برداریوں اور دلداریوں کی خاطر لاکھوں خوشامدوں سے کام لیتے ہیں، جنگلوں کی خاک چھانتے ہیں اور دنیاداروں کے نوع بہ نوع طعنے سنتے ہیں مگر معشوقانِ بے وفا کی چالاکیوں، چال بازیوں، وعدہ خلافیوں، عہد شکنیوں اور دیگر طرح طرح کے انداز ہائے ستمرانیوں سے خواہش وصل سے ہمیشہ محروم رہتے ہیں۔ کسی شاعر نے ایک عاشقِ نامراد کی محرومیوں کا ذکر کرتے ہوئے اسکے محبوب کی شاطرانہ چالاکی کو شاعرانہ چابکدستی سے یوں عیاں کیا ہے:

میرے محبوب نے وعدہ کیا ہے پانچویں دن کا
کسی سے سن لیا ہوگا کہ دنیا چار دن کی ہے

Marfat.com

اسی طرح اگر ہم اپنے معاشرے پر ایک سرسری نگاہ ڈالیں تو ہمیں ہر طرف ان ذمائم کی کارفرمائیاں اور کارستانیاں دکھائی دیتی ہیں۔یقین نہ آئے تو افرادِ معاشرہ کے باہمی روابط اور رویوں پر ایک نگاہ ڈال کر اندازہ کرلیں کہ افسر اور ماتحت، دکاندار اور گاہک، ڈرائیور اور مسافر، بائع اور مشتری، استاد اور شاگرد، وکیل اور مؤکل، مرد اور عورت، میاں اور بیوی، دوست اور دشمن، ڈاکٹر اور مریض، آجر اور اجیر، راج اور مزدور غرض ہر کسی کا ایک دوسرے کے ساتھ برتاؤ میں ان ذمائم کے جراثیم کس تعداد میں پائے جاتے ہیں۔

اِنسانوں کے علاوہ جانوروں میں بھی انہی دو طرح کے طبقے پائے جاتے ہیں جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ لومڑی چالاک ہوتی ہے اور اپنا داؤ بچا کر رکھتی ہے۔ کوّا چور ہوتا ہے اور فاختہ (جسے امن کی علامت سمجھا جاتا ہے) کے انڈے چرا کر پی جاتا ہے اور ہنس کی چال چل کر چالاک ہنستے ہنستے اپنی چال بھی بھول جاتا ہے۔ چیز کو اچک کر لے جانے والی چیل باز اور شکرے کی ریس کرتی ہے مگر اس کے گھونسلے میں کبھی ماس نہیں ملتا۔ بکری بزدل ہوتی ہے مگر بڑی چالاکی اور شیر دِلی سے دودھ میں مینگنیاں ڈال دیتی ہے مگر بکرے کی مان بن کر اس کی خیر منانے کا اسے بہت کم وقت ملتا ہے۔ بھیڑ مسکین ہوتی ہے اور چپکے سے اپنی گردن پر چھری پھرا لیتی ہے۔ گدھا بے وقوف ہوتا ہے اور گھمیار کے ڈنڈے کھانے سے بھی نہیں سدھرتا۔ ہاتھی بھاری بھرکم ہوتا ہے اور سب کا ساتھی ہونے کا دم بھرتا ہے مگر کھانے اور دکھانے کے دانت الگ الگ رکھتا ہے لیکن افسوسناک امر تو یہ ہے کہ کمزور چیونٹیاں شہ زور ہاتھیوں کو پچھاڑ دیتی ہیں۔ شیر اپنی شہ زوری کے بل بوتے پر جنگل کا بادشاہ کہلاتا ہے اور اس کی دھاڑ سن کر ہرن تک اپنی چوکڑیاں بھول جاتے ہیں مگر یہ الگ بات ہے کہ گیدڑ شیر کی کھال پہن کر اپنی گیدڑ بھبکیوں سے شیر نہیں بن پاتا مگر کتا اپنی گلی میں شیر کہلانے کے باوجود بھوں بھوں ہی کرتا رہتا ہے مگر شیر کی دھاڑ کی نقل نہیں اتار سکتا۔ اور یہ بھی سچ ہے کہ شیر اور بکری نہ ایک ساتھ رہ سکتے ہیں اور نہ ایک گھاٹ پر پانی پی سکتے ہیں۔ بلّی کی میاؤں سے چوہے دم دبا کر بھاگ جاتے ہیں اور ان کی اس کے گلے میں گھنٹی باندھنے کی چال نہیں چل سکتی اور بے چارے کبوتر تو بلّی کو دیکھتے ہی آنکھیں موند لیتے ہیں اور خاموشی سے اس کا لقمۂ دہن بن جاتے ہیں۔ گائے اپنے ایک سینگ پر دھرتی کو اٹھانے اور طبعی شرافت کے باعث ہندوؤں کی ماتا بن کر پوجی جاتی ہے مگر مسلمان اسے کاٹ کر کھا جاتے ہیں بھینس ہے کہ عقل سے

Marfat.com

بھی بڑی سمجھی جاتی ہے مگر لاٹھی سے ہانکی جاتی ہے۔ مور اپنی خوبصورتی پر اتراتا اور رقص کرتا ہے مگر بھدے پاؤں کو دیکھ کر رونے لگ پڑتا ہے۔ اونٹ ایسا بے ڈھب کا جانور ہے کہ اس کی کوئی کل بھی سیدھی نہیں مگر اس کے باوجود وہ صحرائی جہاز کے لقب سے ملقب ہے۔ ڈاروں کا بندر اِنسان بن کر بھی بندر کا بندر ہی بنا رہا ہے اور اپنی شوخیوں سے اِنسانوں کا منہ چڑاتا رہتا ہے اور گلے میں موتیوں کی مالا ڈالے اور رک کے ذائقہ سے نا آشنا ہی رہتا ہے۔ مرغا اکڑ اکڑ کر بانگ نکالتا ہے اور مرغی کو دیکھتے ہی اس کے گرد چکر لگا کر اس کی گردن دبوچ لیتا ہے اور جنسی تمنا پوری کیے بغیر نہیں چھوڑتا مگر ہم گھر کی مرغی کو دال برابر سمجھتے ہیں چاہے وہ سونے کا انڈہ ہی کیوں نہ دیتی ہو۔ یہ الگ بات ہے کہ بے چاری مرغی حلال ہوتے ہوئے بھی دو حریص ملاؤں میں حرام سمجھی جاتی ہے سیاہ پوش کوئل اپنی کوکو سے اور بلبل خوبرو اپنے خوش نوا ترانوں سے اِنسانوں کے دِل موہ لیتی ہیں سبز پوش طوطا ٹہنیوں پر لگے پھولوں کا رس چوس چوس کر انہیں ناکارہ کر دیتا ہے اور مالی کے منع کرنے پر اسے آنکھیں دکھاتا ہے مگر بڑھاپے کے عالم میں باوجود کہ اس کی آنتیں قُل ھُوَ اللہُ اَحَد پڑھنے لگ جاتی ہیں مگر وہ اپنی طوطا چشمی سے پھر بھی باز نہیں آتا۔ وفادار کُتا اپنے مالک اور اس کے مال کی حفاظت کرتا ہے اور اس کے دشمن کو آنکھیں دکھا کر اس کے گلے پڑ جاتا ہے مگر لالچی کُتا عکسِ آب کے دھوکے میں آ کر گوشت کے دو ٹکڑے پانے کے بجائے اصل ٹکڑے سے بھی محروم ہو کر رہ جاتا ہے مگر اس امر کی تصدیق ضرور کر دیتا ہے کہ "لالچ بُری بلا ہے" مگر کُتیا جب چور سے مل جاتی ہے تو ضررِ گراں کا باعث بن جاتی ہے۔ کرگس اور شاہین الگ الگ جہانوں میں رہتے ہیں اور ممولہ اپنی دنیا میں بستا ہے شہباز اپنی تیز نگاہی اور بلند پروازی پر نازاں ہوتا ہے اور پلکتے جھپکتے بڑی چالاکی اور مکاری کے انداز میں اپنے شکار کو دبوچ لیتا ہے مگر ممولہ سے جنگ میں مات کھا جاتا ہے۔ اسی طرح نیولہ کے پھرتیلے اندازِ حرب سے سانپ کی زہریلی کاٹ بے اثر ہو کر اسے شکست سے دوچار کرتی ہے۔ سخت جان بجّو جو ہاتھی کے پاؤں تلے بھی نہیں مرتا مردوں کو کھاتا ہے اور مردار خور گدھ اِنسانوں کی ناپسندیدگی کے باوجود فضا میں منڈلاتے پھرتے ہیں۔

ان ذمائم کی اس مبحث کے بعد یہی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں ہم سے اور ہمیں ان سے دور رکھے۔ آمین

Marfat.com

چلتے چلتے

میرے اس عنوان کا مصدر چلنا ہے۔ یہ جس سے بے شمار مرکبات بن کر اُردو میں استعمال ہوتے ہیں۔ اس عنوان کا انتخاب میرے ذہن کی چلا چلی کا ہی نتیجہ ہے کہ وہ چل پھر کر اس عنوان پر چلا آیا ہے۔

چلو اب دیکھتے ہیں کہ اگر سلسلۂ خیال چل نکلتا ہے اور قلم چل پڑتا ہے تو ان دونوں کے باہمی چل چلاؤ سے چلتے چلتے میں کہاں تک چلتا ہوں۔

اس عنوان کی بنیاد اس خیال پر رکھی گئی ہے کہ ایک ہی لفظ جب ساتھ ساتھ دو بار آتا ہے تو اس سے بات میں زور اور تاکید کا پہلو پیدا ہو جاتا ہے۔ اب دیکھتے ہیں کہ میرا یہ خیال دیکھتے دیکھتے کہاں کہاں تک پہنچتا ہے۔

مہینہ بھر سے طبیعت مضمون نویسی کی طرف مائل ہے۔ دماغ صبح و شام اور روز و شب اسی لگن میں مگن ہے۔ بیٹھتے بیٹھتے کوئی نہ کوئی موضوع دماغ میں در آتا ہے تو فکر اور قلم ساتھ ساتھ چل نکلتے ہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے صفحوں کے صفحے تیار ہو جاتے ہیں۔ یقین جانیئے کہ ایک ایک دن اور ایک ایک رات میں بیٹھے بیٹھے، کھڑے کھڑے اور چلتے چلتے دو دو، تین تین یہاں تک کہ چار چار مضامین لکھ لکھ کر بھی تھکن اور اکتاہٹ نہیں ہوئی چنانچہ یہ سلسلہ ہوتے ہوتے اور آہستہ آہستہ چلتے چلتے بایں عنوان (چلتے چلتے) پہنچا ہے اور معلوم نہیں کہ اس کی رفت رفت میں کہاں کہاں جا پہنچے۔ چاہتا ہوں کہ لفظوں کے تکرار تکرار ہی میں مضامین کا ایک مجموعہ جلد جلد تیار ہو کر کتابی شکل میں دکھائی دے سکے۔

جب تو سن طبع دوڑتے دوڑتے اور پھر تخیل اڑتے اڑتے بادلوں تک جا پہنچتا ہے تو بارش کی بوند بوند اور قطرہ قطرہ بن کر ہوتے ہوتے قرطاس ابیض پر مضامین کی شکل میں گر پڑتا ہے۔

کام کرتے کرتے ہو جاتے ہیں اور رہتے رہتے رہ جاتے ہیں اسی لئے یہ کہاوت بنی ہے کہ ''آج کا کام کل پر نہ چھوڑو''۔ استاد اس کہاوت پر عمل کرنے کے لئے کہتے کہتے اور ناصح

Marfat.com

اس پر زور دیتے دیتے اور تلقین کرتے کرتے نہیں ہارتے مگر ہم ہیں کہ ہمارے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی بلکہ یہ نصیحت آمیز کہاوت سنتے سنتے ہمارے کام پک جاتے ہیں اور ہم سنی ان سنی کر دیتے ہیں۔

انسان پڑھتے پڑھتے عالم بنتا ہے اور لکھتے لکھتے مصنف۔ گاتے گاتے کلاونت، پڑھاتے پڑھاتے استاد، کرتے کرتے فنکار، کہتے کہتے واعظ، سوچتے سوچتے مفکر، بیٹھتے بیٹھتے کاہل اور بڑھتے بڑھتے کامیاب بنتا ہے۔ وہ جیتے جیتے جیتا ہے اور مرتے مرتے مرتا ہے۔

مسخرہ باتوں باتوں سے حاضرین کو ہنساتا ہے۔ وہ خود نہیں ہنستا مگر ہنسنے والے ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو جاتے ہیں۔ مداری کے طرح طرح کے کرتب دیکھ کر ناظرین حیران و ششدر ہو جاتے ہیں۔ گویا گاتے گاتے سامعین کو مسحور کرتا ہے اور کوا اپنی کائیں کائیں سے کان کھاتا ہے۔

بیج زیرِ زمین پنپ پنپ کر سطح زمین پر نمودار ہوتا ہے اور دیکھتے دیکھتے ہی پودا بن جاتا ہے اور رفتہ رفتہ بڑھتے بڑھتے ایک تناور درخت بن جاتا ہے اور ہوتے ہوتے اس کی شاخیں پتوں، پھولوں اور پھلوں سے لد جاتی ہیں۔ یہی حال فصلوں کا ہے جن کے دانے دانے پر کھانے والوں کا نام رقم ہوتا ہے۔

بھکاری در در بھٹکتا ہے اور گھر گھر سے بھیک مانگتا ہے۔ ڈھنڈورچی ڈھول بجا بجا کر اور پکار پکار کر اعلان کرتا ہے۔ بچے گلے پھاڑ پھاڑ کر چیختے ہیں اور زور زور سے روتے ہیں اور چیختے چیختے اور روتے روتے ان کی گھگی بندھ جاتی ہے۔ بار بار دہرانے سے سبق ازبر ہو جاتا ہے۔ بار بار لکھنے سے خوش نویسی میں اضافہ ہوتا ہے اور بار بار کی مشق سے مہارت حاصل ہوتی ہے۔

گھر گھر میں ساس بہو کی روز روز کی، کل کل سے نت نئے ایسے مسائل پیدا ہو جاتے ہیں جن کا دور دور تک کوئی حل نظر نہیں آتا۔ بات بات پر ان کی نوک جھوک گھر کے سکون کو برباد کر دیتی ہے اور گھٹن کی سی فضا میں سب افراد کنبہ گھٹ گھٹ کر سانس لینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

بھیڑ میں کھوا کھوا چھلتا ہے اور آدمی آدمی ٹکراتا ہے اور سنبھل سنبھل کر چلتے چلتے بھی بھیڑ میں پھنس کر گر پڑتا ہے۔ وہ پھنس پھنس کر نکلتا اور گر گر کر اٹھتا ہے اور اٹھ اٹھ کر اور بچ بچ کر بھیڑ سے نکلنے کی کوشش کرتا ہے مگر نکلتے نکلتے بھی اسے قدم قدم پر مشکل پیش آتی ہے۔

Marfat.com

زندگی آنی و فانی ہے۔ یہ آرزوں اور خواہشوں سے بھر پور ہے۔ حسرتوں اور مایوسیوں کا مجموعہ ہے۔ کامیابیوں اور ناکامیوں کا مرغوبہ ہے مگر حقیقتاً گزشتنی ہے۔ گزر ہی جاتی ہے ایسے تیسے، جیسے تیسے، ہنس ہنس کر، ایڑیاں رگڑ رگڑ کر یا رو رو کر۔ راہِ حیات پر قدم قدم مصائب و مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اسکے لمحے لمحے، پل پل اور گھڑی گھڑی میں پتہ نہیں کیا کیا کچھ ہو جانے کی توقعات و خدشات کی امیدیں اور حسرتیں ایک ساتھ ہونی اور انہونی صورتوں میں اسکے گرد گردش کرتی رہتی ہیں۔ پس چاہیئے کہ درپیش حالات و واقعات کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا چاہیئے۔ مصائب و آلام کی اوکھن لگاٹیوں کو پاٹ کر تقاضائے حیات سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کرنا چاہیئے۔

رنج و راحت کے وقت اور کامیابیوں اور ناکامیوں پر ثابت قدم رہنا چاہیئے۔ ان پر اترانا اور گھبرانا نہیں چاہیئے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اسے رو رو کر بلکہ ہنس ہنس کر گزرنا چاہیئے اور فارسی کے ان مقولوں پر عمل پیرا رہنا چاہیئے کہ

زندگی آمد برائے بندگی زندگی بے بندگی شرمندگی

اور

خوردن برائے زیستن و ذکر کردن است نہ کہ زیستن برائے خوردن

لیجئے آہستہ آہستہ، کہتے کہتے، لکھتے لکھتے اور ہوتے ہوتے "چلتے چلتے" اپنے انجام کی طرف بڑھتے بڑھتے اور پہنچتے پہنچتے پہنچ رہا ہے اور میں بھی جاتے جاتے یہی کہتے کہتے جاتا چاہتا ہوں۔

دنیا چل چلاؤ کا راستہ ہے جس پر کوئی آتا ہے اور کوئی جاتا ہے۔ آمد و رفت کا یہ سلسلہ ازل سے ہے اور ابد ابد تک قائم و دائم رہے گا۔ یہ راستہ چلتے چلتے ہی طے کیا جاتا ہے لہٰذا اس پر چلتے رہیئے کیونکہ اس پر چلنا ناگزیر ہے بس اس پر طوعاً و کرہاً جیسے بھی بن پڑے چلتے ہی رہیئے۔ مری دعا ہے کہ اس پر چلتے چلتے ہم سب کا انجام بخیر ہو۔ آمین

Marfat.com

چوراورخور

چوراور خور دونوں کا تلفظ واؤ مجہول سے ہے ورنہ معنوں میں زمین وآسمان کا فرق آجائے گا۔ چور اُردو کا اسم مذکر ہے اور خور فارسی کے مصدر خوردن کا صیغہ امر ہے جو بطور لاحقہ کسی اسم کے بعد آکر اسے اسمِ فاعل بنا دیتا ہے جیسے: آدم خور اور بسیار خور وغیرہ۔ چور سے چوری اور خور سے خوری اسمائے کیفیت ہیں۔ چوری اور خوری دونوں لت اور چسکے کے سوا کچھ نہیں جو ایک بار پڑ جائے یا لگ جائے تو کبھی نہیں چھٹتے۔ لاکھ کوشش کے باوجود بھی ان سے چھٹکارا ممکن نہیں بظاہر اگر ان کو چھوڑا بھی جائے تو بھی ان کے اثرات ضرور باقی رہتے ہیں جیسے کہ یہ مثال زبان زد عام و خاص ہے کہ "چور چوری سے جائے مگر ہیرا پھیری سے نہ جائے"

چور کو فارسی میں دزد، عربی میں سارق اور انگریزی میں تھیف (Thief) کہتے ہیں۔ چور چوری کرنے والے، مکار اور فریبی کو کہتے ہیں۔ یہ بدگمانی، خفیہ، در پردہ اور اندیشہ وخوف کے معنی بھی دیتا ہے۔ تاش کے اس پتا کو بھی چور کہتے ہیں جو کھیلنے سے رہ جائے یا جسے دوسروں سے چھپائے رکھتے ہیں۔ یہ بطور سابقہ اور لاحقہ بھی استعمال ہوتا ہے۔ بطور سابقہ اس سے بے شمار الفاظ بنتے ہیں جیسے: چور بابو (ریگِ رواں، سراب) چور بدن (وہ جسم جس کے موٹائی دکھائی نہ دے) چور پانی (جو ساحل سمندر کی ریت کھود کر نکالتے ہیں) چور پیٹ (جس کے حمل کا دیر تک پتہ نہ چلے) چور سپیا (جو خاک میں گر کر بمشکل ملے) چور تھانگ (جو چوری کا مال لیتا ہو) چور ہٹا (وہ دکان دار جو چوروں سے مال خریدتا ہو) چور محل (داشتہ) علاوہ ازیں چور راستہ، چور گلی، چور خانہ، چور گڑھا، چور پہرا، چور سیڑھی، چور دروازہ، چور تالا وغیرہ۔

چور کے حوالے سے بہت سی ضرب الامثال بھی وضع کی گئی ہیں جیسے: چور جانے چور کی سار (چور کو چور ہی پہچانتا ہے۔ بفارسی ولی را ولی می شناشد) لیکن انگریزی کا یہ مقولہ لاجواب ہے کہ (To set a Theif to Catch a Thief) یعنی چور کو چور ہی پکڑتا ہے۔ چور چکار چوکے لیکن چغل نہ چوکے (چور چوری تو چھوڑ سکتا ہے مگر چغل خور چغلی نہیں چھوڑ سکتا) چور سے کہے

Marfat.com

چوری کر سادھ سے کہے تیرا گھر لٹا (اس کی نسبت بولتے ہیں جو خود ہی نقصان کرائے اور خود ہی ہمدرد بنے) چور کا بھائی گٹھ کترا (بُرے کا ساتھی بھی بُرا ہی ہوتا ہے) جو حال چور کا سو حال میرا (صفائی اور بے گناہی کے اظہار کے موقع پر بولتے ہیں) چور کو چوری ہی سوجھتی ہے (بُرے کو بُرا کام ہی نظر آتا ہے) چور کی داڑھی مین تنکا (چور کو خود ہی کھٹکا رہتا ہے) چور اور سانپ کے پیر کہاں (چور میں استقلال نہیں ہوتا ذرا سے کھٹکے سے بھاگ جاتا ہے) چور کا سر نیچا (شرمندگی کے باعث چور سر نہیں اٹھا سکتا) چور کا مال سب کوئی کھائے چور کی جان / اکارت جائے (چور کے مال میں حصّہ دار تو بہت لوگ ہوتے ہیں مگر اس کی سزا میں کوئی حِصّہ دار نہیں ہوتا) پنجابی میں بھی اس کی دو مثلیں بڑی عام اور مشہور ہیں جو ہم اکثر استعمال کرتے ہیں:

۱) چورا چکا چودھری تے غنڈی رن پردھان

۲) چوروی آکھن چور دچور

چور کی طرح چوری سے بھی بہت سی کہاوتیں منسوب ہیں جیسے: چوری اور چترائی (چوری کے ساتھ ساتھ حیلہ بازی کرنا) چوری اور سینہ زوری (اپنے عیب / نقص پر نادم نہ ہونا) چوری کا گُڑ میٹھا (مفت کا مال اچھا لگتا ہے) چوری کا کپڑا ڈانگوں کے گز (مالِ مفت دلِ بے رحم یعنی چوری کے مال کی قدر نہیں ہوتی)۔

چور اور چوری کی اِقسام بھی بے شمار ہیں مثلاً غلّہ چور۔ گندم چور۔ آٹا چور۔ گنا چور۔ راز چور۔ لوہا چور۔ آلات چور۔ جوتی چور۔ کفن چور۔ آدم چور۔ چینی چور۔ مویشی چور اور کام چور وغیرہ غرض جس چیز کی بھی چوری کی جائے وہ شخص اسی کا چور کہلاتا ہے۔ حسین لوگ دِل کی چوری کرتے ہیں اور ادیب و شاعر دوسروں کی تحریروں اور شعروں کو چوری کرتے ہیں اور بعض لوگ تو کتابوں اور دیوانوں تک کی چوری کر لیتے ہیں ایسے چور نقلی ادیب اور جعلی شاعر ہونے کے باوصف تخلیق کار ہونے کے دعویدار ہو کر صاحب کتب بن جاتے ہیں۔

موجودہ دور میں تو پانی، بجلی اور ٹیکس کی چوری تو اتنی عام ہے کہ اسے معمول کا درجہ حاصل ہو چکا ہے اور اس کے حمام میں تو بڑے بڑے پردہ نشین بھی ننگے نظر آتے ہیں جن پر میرے خیال میں فارسی کی یہ ضرب المثل بڑی صادق آتی ہے کہ "چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد" سمگلنگ چوری کی انتہائی اور ترقی یافتہ جدید صورت ہے جسے بڑا منافع بخش کاروبار تصور

Marfat.com

کیا جاتا ہے چاہے یہ مال کی ہو یا کرنسی کی، چاہے بچوں کی ہو یا بڑوں کی۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ مکروہ اور گھناؤنا کاروبار انسانیت کے نام پر ایک بدنما داغ ہے۔ اغوا برائے تاوان بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جو مِنی برلالچ ہے۔

اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو ہم سب چور ہیں۔ کوئی چھوٹا چور اور کوئی بڑا چور ہے۔ چھوٹے چور چھوٹی چوریاں کرتے ہیں اور بڑے چور بڑی بڑی۔ کوئی لاکھ چھپائے لیکن ہمارے اندر کا چور کبھی نہیں چھپتا جو ہمیں کسی نہ کسی چوری پر اکساتا رہتا ہے چاہے وہ غور و فکر کی چوری ہو یا مال و اشیاء کی۔ چاہے کسی کی خیر خواہی کی ہو یا حماقت کی۔ چاہے کسی کی بدخواہی کی ہو یا مخالفت کی۔

چوری کی دو وجوہ ہیں _____ ضرورت یا مجبوری _____ مگر اسے معمول بنالینا یا گداگروں کی طرح اسے ہمیشہ اپنالینا کسی صورت جائز نہیں مگر انگریزوں کا یہ مقولہ ہماری سمجھ سے تو ماورا ہے کہ

"If you want to have a thing borrow it, buy it or steal it."

جبکہ وہ خود چوری کو ایک فعل قبیح گردانتے ہوئے یہاں تک کہتے ہیں کہ "Copying is stealing"

چوروں کی طرح خوروں کی بھی کئی اِقسام ہیں مثلاً: آدم خور، حرام خور، گوشت خور، موش خور، سبزی خور، رشوت خور، کمشن خور، چندہ خور، پلاٹ خور، مال خور، خزانہ خور وغیرہ غرض جو کوئی بھی جو کچھ کھاتا ہے وہ ویسا ہی خور کہلواتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ہر قسم کا خور بالآخر خوار ہوتا ہے مگر حیرت یہ ہے کہ وہ اپنی خواری کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھتا۔

وہ زمانے لد گئے جب چوری چھپے اور عام طور پر رات کی تاریکی میں کی جاتی تھیں اور اس فعل کو بڑا معیوب، قبیح اور لائقِ نفرت تصوّر کیا جاتا تھا مگر آج کل چوری کا دھندہ تو اتنا عام ہو چکا ہے کہ دن دیہاڑے اور دندناتے ہوئے کام میں لایا جاتا ہے اور اسے ہرگز معیوب اور قابلِ نفرت سمجھا جاتا بلکہ سمبل آف سٹیٹس گردانا جاتا ہے۔

المختصر چور چور ہی ہے۔ وہ لاکھ کوشش کے باوجود بھی سادھ نہیں بن سکتا اور چوری کبھی چھپی نہیں رہتی جب بھی پکڑی جاتی ہے قابلِ تعزیر ہوتی ہے لہٰذا باور کر لینا چاہیئے کہ چور اور چوری ہر دو بدترین اور قابلِ نفرت ہیں اگرچہ کفن چور اور دِل چور بڑے ظالم اور بہت بُرے سمجھے جاتے ہیں مگر کام چور سب سے بُرا ہے اور کام چوری سب سے بُری عادت ہے جو ہماری شخصیت کو پامال اور مسخ

Marfat.com

کر دیتی ہے۔ چوروں کا سر کچلنے اور چوری کی ہر طرح کی وارداتوں کے انسداد کے لئے نہایت موثر قانونی اقدامات کو اشد ضرورت ہے جو حکومتی سطح کا کام ہے مگر سب سے بڑھ کر انفرادی اور اجتماعی طور پر ہمیں اس کے لئے شعور پیدا کر کے فیصلہ کن اقدامات کی ضرورت نہایت ہی اہم ہے۔

بعینہٖ خور اور خوری قابلِ ملامت ہیں۔ بلاشبہ آدم خور بنی نوع اِنسان کا سب سے بڑا جانی دشمن ہے مگر رشوت خور نہ صرف عوام الناس کو لوٹنے کا ظلم کرتا ہے بلکہ خود پر بھی ظلم کرتا ہے اور لقمہ حرام سے اپنی اولاد کی غلط پرورش کا بھی مرتکب ہو کر اپنی اور اپنی اولاد کی عاقبت خراب کر لیتا ہے لہٰذا ہمیں حرام خوری سے ہر چند اجتناب کرنا چاہیئے اور حلال خوری کی سعی سعید کرنا چاہیئے۔ سبزی خوری کو گوشت خوری پر ترجیح دینا چاہیئے اور بسیار خوری سے پرہیز کرنا چاہیئے اور ہمیشہ فارسی کے اس مقولہ کو پیشِ نظر رکھنا چاہیئے کہ

"تنور شکم دم بدم تافتن مصیبت بود روز نایافتن" اور بسیار خور کے لئے تو بس ہماری یہی دعا ہے کہ خدا تعالیٰ اسے ہدایت دے تا کہ وہ آپ اپنا دشمن نہ بنے۔

Marfat.com

چھُری اور چاقو

چھری اور چاقو دونوں اسمِ آلہ ہیں۔چھری مونث ہے اور چاقو مذکر ہے۔چھری کا مذکر تو چھرا ہے مگر چاقو مونث ندارد۔قینچی کو زبردستی اس کی تانیث سمجھا جاتا ہے حالانکہ قینچی کا مذکر ہے قینچا جسے باغبان استعمال کرتے ہیں پنجابی میں بڑی قینچی کو قینچ کہتے ہیں جس سے بھیڑوں کی اون تراشی جاتی ہے۔

چاقو کو تہہ ہونے والی چھری بھی کہتے ہیں یوں اسے چھری کا بھائی بھی تصوّر کیا جاتا ہے کیونکہ دونوں بہن بھائی کاٹنے تراشنے کے کام آتے ہیں۔ادھار کو محبت کی قینچی کہا جاتا ہے اور زبان کی تیزی وطراری کو چھری سے تشبیہ دی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ زبان ہے کہ قینچی یا پھر زبان طرازی کے متعلق یوں کہتے ہیں کہ (اس کی زبان) قینچی کی طرح چلتی ہے۔انگریز چھری کانٹے سے کھاتے ہیں اور یوں ہاتھوں کی نعمت کا کفران کرتے ہیں۔البتہ چھری اور چھرا دونوں قصاب کے ہتھیار ہیں جن سے وہ گوشت کے ٹکڑے ٹکڑے بلکہ بوٹی بوٹی کر کے بیچتا ہے اور اپنی روزی کماتا ہے۔وہ اپنے پیشہ ور بھائی کو چھری بند بھائی کہتا ہے اور چھری مار گدا گر زبردستی خیرات لینے کے لئے اپنے جسم کو چھری سے زخمی کر لینے کا حربہ استعمال کرتے ہیں فقیروں کے اس ٹولے کو گرز مار بھی کہتے ہیں۔چھریوں کی لڑائی کو چھری کٹاری کہتے ہیں جس سے یہ ضرب المثل بنی ہے کہ "چھری بھلی نہ کٹاری" اور پنجابی جب زبردستی جلد کام کرنے پر مجبور ہو جائے تو یہ کہاوت بولتے ہیں کہ "چھری تے مُکّی" جب کسی کی نیت میں بگاڑ آجاتا ہے تو اس کی ایذا رسانی کو "بغل میں چھری نیت بُری" کہہ کر واضح کرتے ہیں کہ ہندوؤں کی فطری منافقانہ ذہنیّت کے اظہار کے لئے تو یہ ضرب المثل مشہور ہے کہ: "بغل میں چھری منہ میں رام رام"

چھری ہو، چاقو ہو یا قینچی ہو سب کا کام چلنا ہے اور صفت کاٹنا ہے۔یہ سب چلنے اور کاٹنے کے ساتھ ساتھ پھرتے بھی ہیں۔قینچی جب کپڑے پر پھرتی ہے تو اسے لیر لیر کر دیتی ہے۔چاقو جب لڑائی جھگڑے میں چل جاتا ہے تو زخموں پہ زخم لگاتا چلا جاتا ہے اور اس کے بعض کاری زخم

Marfat.com

ہلاکت کا بھی باعث بن جاتے ہیں۔چھری یوں تو عام طور پر سبزی ترکاری بنانے کے کام آتی ہے مگر جب بکرے کی گردن پر چلتی ہے تو اسے کاٹ کر رکھ دیتی ہے۔خربوزے پہ لگے یا خربوزہ اس پر لگے تو نقصان خربوزے کا ہی ہوتا ہے اس کا کچھ نہیں بگڑتا البتہ جب یہ دِل پر چلتی ہے تو اسے ضرور گھائل کر دیتی ہے۔بقول شاعر:

دیکھا جو حسن یار طبیعت مچل گئی آنکھوں کا تھا قصور چھری دِل پہ چل گئی

لطف کی بات تو یہ ہے کہ لُتری عورت کو جو لڑائی جھگڑے کرا دیتی ہے اسے پتنگ چھری کہتے ہیں۔

تیر،تلوار اور خنجر کا شمار بھی اسی خاندان میں ہوتا ہے۔تیر جب ایک بار کمان سے نکل جاتا ہے تو پھر کبھی واپس نہیں آتا۔اس کا ہدف پر لگنا یا نہ لگنا تیر انداز کی مہارت پر منحصر ہوتا ہے مگر تلوار اپنے نیام سے نکل کر اپنے جوہر دکھاتی ہے اور پھر نیام میں آ چھپتی ہے لیکن خنجر کمال کی چیز ہے یہ بغل میں سے نکال کر چپکے سے کسی کے پیٹ میں گھونپا جاتا ہے جس سے انتڑیاں باہر آ جاتی ہیں اور اس کا مضروب قسمت سے ہی جانبر ہوتا ہے۔

کتاب عشق میں زیادہ تر ذکر تیر اور خنجر کا آتا ہے یا پھر تھوڑا کٹار کا مگر اس میں تلوار کا ذکر سب سے کم ملتا ہے۔معشوق تیر و خنجر کا ہی دھنی ہوتا ہے۔وہ انہی سے کام چلاتا ہے۔تلوار اٹھانے کی شاید اس کے بازوؤں میں سکت نہیں ہوتی جبھی تو شاعر نے کہا ہے کہ

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا

کہ لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

اس کی نگاہوں کے ٹیڑھے ترچھے تیر بھی اپنا کام کر جاتے ہیں مگر پھر بھی شاعر اسے تیرِ نگاہ کو سیدھا کرنے کا مشورہ دیتا ہے شاید اس لئے کہ وہ چاہتا ہے کہ اس کے محبوب کا یہ تیر سیدھا آ کر اس کے دِل میں پیوست ہو کر وہیں کا ہو رہے۔

گرز، نیزے، بھالے اور ڈھال کے بیان کے بغیر اس مہلک خاندان کا ذکر مکمل نہیں ہوتا۔پاک و ہند میں کشتی کا میدان مارنے والے پہلوان کو ٹرافی کی جگہ گرز دیا جاتا ہے۔گرز اوپر سے گول اور موٹا ہوتا ہے اور بھاری بھرکم ہوتا ہے اس کا استعمال صرف تنومند جوان مرد ہی کر سکتا ہے پاک و ہند میں کشتی کا میدان مارنے والے پہلوان کو ٹرافی کی جگہ انعام دیا جاتا ہے۔نیزہ گرز کے مقابلے میں ہلکا پھلکا ہوتا ہے جس سے ہر جنگجو بڑی آسانی سے کام لے سکتا

Marfat.com

ہے۔ یہ ایک جنگی ہتھیار ہے مگر کھلاڑی نیزہ پھینکنے کا کھیل کھیلتا ہے۔ بھالا فارسی نیزے کا ہندی بھائی ہے اسے برچھا بھی کہتے ہیں جس کی تصغیر اور تانیث برچھی کہلاتی ہے۔ یہ بھی نیزے کی طرح ہی کام کرتا ہے۔ ان دونوں میں کوئی فرق نہیں۔

رہی ڈھال؟ سو وہ اس خاندان کی سب کی پسندیدہ بہن ہے یوں تو یہ تیر، تلوار یا نیزے وغیرہ کا وار روک کر سب کی حفاظت کرتی ہے اور دشمن تک کی حفاظت کے بھی کام آتی ہے۔

موجودہ دور میں جب سے جدید سائنس اور ٹیکنالوجی کا اس خاندان میں اثر ونفوذ بڑھا ہے اس نے بندوق، توپ اور ٹینک سے لیکر میزائل اور ایٹم بم جیسے ہلاکت آفرین آلات حرب سے نواز دیا ہے جو آنِ واحد میں ملکوں کے ملک اور قوموں کی قومیں نیست ونابود کر سکتے ہیں۔ دعا ہے کہ قادرِ مطلق ان سب کی ہلاکت خیزیوں سے بنی نوعِ انسان کو اپنی پناہ میں رکھے۔

میری مانیئے اور ان سب آلات واوزار کو چھوڑیئے صرف چھری اور چاقو کے نام یاد رکھیئے اور ان سے صرف کاٹنے تراشنے کا کام لیجئے جس کے لئے کہ وہ بنائے گئے ہیں اور ان کا غلط اور ناجائز استعمال ہرگز نہ کیجئے۔

Marfat.com

چھوٹا اور بڑا

چھوٹا اور بڑا اُردو کے متضاد الفاظ ہیں۔ دونوں مذکر اور بطور صفت کے استعمال ہوتے ہیں۔ ان کی تانیث چھوٹی اور بڑی ہے اور بطور جمع چھوٹے اور بڑے کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں عربی میں صغیر اور کبیر کے الفاظ ان کے ہم معنی ہیں مگر عام طور پر اصغر اور اکبر کو ان کے متبادل الفاظ سمجھا جاتا ہے جو کہ صحیح نہیں کیونکہ ان میں تفضیل کا درجہ ہے یعنی بہت چھوٹا اور بہت بڑا۔ چھوٹا اور بڑا (دونوں) ایک ساتھ بھی استعمال ہوتے ہیں جو "سب" کے مفہوم کو ظاہر کرتے ہیں مگر ان کا تضاد برقرار رہتا ہے جیسے "چھوٹے بڑے" یعنی ادنیٰ واعلیٰ، غریب امیر، بچے بوڑھے۔

چھوٹے اور بڑے کی تفریق جاننے کے کئی پیمانے ہیں مثلاً: قد، عمر، رتبہ، مرتبہ، مقدار، تعداد، عزّت، دولت، شہرت، وسعت، نسل، خاندان، اونچائی، گہرائی، لمبائی، چھوٹائی، چوڑائی، سوچ، فکر وغیرہ وغیرہ مگر ''بڑا'' کا لفظ مونگ یا ماش کی تلی ہوتی ٹکیا کے معنی دیتا بڑا عجیب سا لگتا ہے۔ اسی طرح "چھوٹا" کا استعمال معمولی یا خفیف اور ناچیز یا بے قدر کے معنوں میں تو جچتا ہے مگر ذلیل یا کمینہ کے معنوں میں بھلا نہیں لگتا۔ تاہم بادی النظر میں ان کی تخصیص کا عام سا کلیہ بڑا دِل پزیر ہے جو سادہ لوحوں کا تراشیدہ ہے مگر حقیقت وصداقت کا آئینہ دار ہے یعنی جس کے پاس زیادہ طاقت (زور وزر اور اختیارات) ہے وہ بڑا ہے اور جس کے پاس کم طاقت ہے وہ چھوٹا ہے۔ فارسی کی یہ ضرب المثل "دستِ زور بالا" اور پنجابی کی یہ کہاوت "زور راں وراں داتئیں ویہہ سو" اسی حقیقت کی عکاس ہیں۔ یقین نہ آئے تو معاشرہ میں پولیس پٹواری کے کردار پر نظر ڈال لیجئے۔ ان دونوں کے بارے میں میرے تاثرات تو بس یہی ہیں کہ

''حکومتیں آتی جاتی رہتی ہیں مگر پولیس باقی رہتی ہے'' اور ''فلک پہ باری زمین پہ پٹواری''

اور سب سے بڑھ کر آپ کے اور میرے مشاہدات کا حاصل بھی یہی ہے کہ سب سے بڑا پیسہ ہے جو چھوٹے کو بھی بڑا بنا دیتا ہے۔ بڑا بننا یا بڑا ہونا بہت بڑی اور اچھی بات ہے مگر یاد رہے کہ اس کا معیار اور کسوٹی صرف اور صرف کردار ہے۔ بڑا کام کرنے سے آدمی یقیناً اپنا نام بڑا کر سکتا ہے اور کوئی بھی شخص بڑی دولت کے بل بوتے پر، بڑے پیٹ سے، بڑے گھرانے کی نسبت سے، بڑے

Marfat.com

بڑے بول بولنے یا بڑی بڑی باتیں کرنے سے ہرگز بڑا نہیں بن پاتا اور یہ بھی مت سمجھیئے کہ چھوٹا کام کرنے سے آدمی چھوٹا بن جاتا ہے کیونکہ بعض اوقات چھوٹے آدمی کا چھوٹا سا کام بھی اسے بڑا بنا دیتا ہے۔ درحقیقت کسی کے بڑے پن یا چھوٹے پن کا اندازہ لگانے کے لئے اس کے کردار اور عمل کے نیک و بد کا پیمانہ ہی کام میں لایا جاتا ہے۔

ان دونوں الفاظ کا مختلف صورتوں میں استعمال بڑا پر معنی ہے۔ ان سے بننے والے مرکبات و محاورات، کہاوتیں اور مقولے لطف سے خالی نہیں ہیں۔ آیئے ان میں سے چند ایک کا احاطہ کرتے ہیں۔ پہلے چھوٹے کا چھٹا پا دیکھتے ہیں پھر بڑے کا بڑا پا دیکھیں گے:

چھوٹا استنجا (پیشاب کرنے کے بعد ڈھیلے سے پیشاب خشک کرنا) چھوٹا چلّہ (زچہ کو چھٹے دسویں دن کا غسل دینا) چھوٹا صاحب (بڑے افسر کا امدادی افسر) چھوٹا کپڑا (انگیا) چھوٹا منہ بڑی بات (بڑوں کی عیب جوئی) چھوٹا منہ بڑا نوالہ (حیثیت سے زیادہ مل جانا) چھوٹا گھر بڑا سمدھیانہ (حیثیت چھوٹی مگر تعلقات بڑوں سے) چھوٹا سا منہ (دیکھنے میں غریب حقیقت میں امیر) چھوٹا سب سے کھوٹا (پست قد آدمی بہت شریر ہوتا ہے) چھوٹوں سے بڑے ہوتے ہیں (چھوٹے آہستہ آہستہ بڑے ہوتے ہیں۔ غریب امیر اور ادنیٰ اعلیٰ ہو جاتے ہیں) چھوٹے بڑے (ادنیٰ اعلیٰ۔ سب) چھوٹے دِل کا (کم حوصلہ) چھوٹے سے میاں نمازی، بڑی سی دُم (چھوٹا قد اور لمبی داڑھی۔ حیثیت کم اور اخراجات زیادہ) چھوٹے گاؤں سے ناتا کیا (چھوٹے گاؤں یا رشتہ داروں سے کیا تعلق) چھوٹی بات (معمولی معاملہ) چھوٹی امت کے لوگ (نیچ لوگ)۔ چھوٹی کھونٹی کا (ٹھنگنا آدمی یا گھوڑا)۔

اب بڑے کا بڑا پا ملاحظہ کیجئے:

بڑا استاد (چالاک ہشیار) بڑا جانور (سؤر۔ گائے۔ بیل) بڑا بول (تکبّر کی بات) بڑا جگر/ کلیجا/ دِل (حوصلہ) بڑا دِن (25 دسمبر) بڑا روگ (سِل۔ دِق) بڑا ابّا (دادا۔ نانا) بڑا بوڑھا (سرپرست) بڑا سؤر (بہت بدذات) بڑا کرنا (اونچا کرنا۔ پالنا پوسنا) بڑا نوالہ کھائے بڑا بول نہ بولے (کھائے خوب مگر تکبّر نہ کرے)۔

بڑی بات۔ بڑی الائچی۔ بڑی چیز (اہم۔ باعزت) بڑی ڈیوڑھی/ سرکار (امیر/سخی آدمی) بڑی شادی (تقریبِ ختنہ) بڑی ناک والا (غیرت مند) بڑی بڑی باتیں کرنا (بہت کچھ کہنا) بڑی

Marfat.com

دور کی سوجھنا (دور اندیشی کرنا) بڑی بہو بڑا بھاگ (دلہن دلہا سے بڑی ہو تو قسمت اچھی ہوتی ہے)بڑی بہو کو بلاؤ جو کھیر میں نمک ڈالے (جب کسی ہوشیار آدمی سے کوئی کام بگڑ جائے تو کہتے ہیں) بڑی بھابی ماں کی جگہ (بڑی بھابی والدہ کے درجے کے برابر ہوتی ہے) بڑی بھینس پر بالائی (جیسے بڑی بھینس کے دودھ پر بالائی زیادہ آتی ہے ایسے ہی امیر آدمی سے بڑے فائدے ہوا کرتے ہیں) بڑی مچھلی چھوٹی کو کھا جاتی ہے (زبردست زیردست کا مال کھا جاتا ہے) بڑی نند شیطان کی چھڑی جب دیکھو تیری کھڑی (بڑی نند بجلی پسند) (یعنی نند بھاوج کی کبھی نہیں بنتی)

بڑے آدمی۔ بڑے ابا۔ بڑے بڑے۔ بڑے بوڑھے۔ بڑے صاحب۔ بڑے بول۔ بڑے حضرت (طنزاً شریر) بڑے دتار (طنزاً کنجوس) بڑے رستم (طنزاً بزدل) بڑے پاپڑ پیلنا (بہت قسم کے کام کرنا) بڑے پاؤں پھیلانا (بڑا جھگڑا کرنا) بڑے اَن پورنا بنے ہیں (خود کو بڑا فیاض سمجھتے ہیں) بڑے برتن کی کھرچن بھی بہت ہے (بگڑے رئیس یا بڑے گھر سے بھی کچھ نہ کچھ فائدہ ہو ہی جاتا ہے) بڑے بول کا سر نیچا (غرور کا سر نیچا) بڑے میاں تو بڑے میاں چھوٹے میاں سبحان اللہ (سب شرارتی ہیں)۔

سارا کنبہ ہی ایک جیسا ہے۔ایک سے ایک بڑھ کر ہے) بڑے شہر کا بڑا چاند (بڑے شہروں میں بدمعاش بھی بڑے بڑے ہوتے ہیں۔ بڑے آدمیوں کی بات بڑی ہوتی ہے)۔

"چھوٹا اور بڑا" کی ان چھوٹی بڑی باتوں سے میرا تو چھوٹا سا خیال یہی ہے کہ چھوٹا چھوٹا ہے اور بڑا بڑا۔ چھوٹا کبھی بڑا نہیں بن سکتا مگر بڑا کبھی کبھار مصلحتاً خود کو چھوٹا بنا لیتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ "چھوٹا منہ اور بڑی بات" کے مصداق چھوٹا کبھی کبھار جب کوئی بڑی بات کہہ دیتا ہے تو داد پا لیتا ہے مگر بڑا اگر کوئی چھوٹی بات کہہ دے تو بُرا لگتا ہے مگر آج کل تو چھوٹوں کو ایسی ہوا لگ گئی ہے کہ وہ خود کو بڑے سمجھتے ہیں اور بڑوں کو چھوٹا جانتے ہیں۔ چھوٹے بڑے کی پہچان ہی مٹ رہی ہے۔ میرے خیال میں تو یہی بہتر ہے کہ چھوٹے چھوٹے ہی بنے رہیں تو اسی میں ان کی بھلائی ہے اور بڑے اپنے تئیں بڑا ہی بنائے رکھیں تو اسی میں ان کی بڑائی ہے۔ نہ چھوٹا بڑے پن کا دعویدار بنے اور نہ بڑا چھوٹے پن سے کام لے اور ہم سب یہ جان لیں کی سوائے خدا تعالیٰ کے کوئی بھی بڑا نہیں اور آدمیوں میں بڑا وہی ہے جس کا کام بڑا ہے۔ نام سے کوئی بڑا نہیں ہوتا بلکہ عقل میں یا کام سے بڑا ہوتا ہے۔

Marfat.com

حیرت اور حسرت

حیرت اور حسرت کا تعلق ایک ہی خاندان سے ہے مگر وہ سوتیلی نہیں بلکہ حقیقی بہنیں ہیں یعنی ایک ہی ماں کی پیدائش ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ حیرت حسرت سے بڑی ہے اور بعض کا خیال ہے کہ حسرت حیرت سے بڑی ہے مگر حقیقت پسندوں کا یہ کہنا ہے کہ ان کا چھوٹا یا بڑا ہونا یا بننا حالات وواقعات کا مرہونِ منت ہے جن کے دباؤ یا ان کی سنگینی کی شدّت یا کمی ان میں سے کبھی کسی ایک کو بڑا اور کبھی چھوٹا بنا دیتی ہے۔ آیئے ان کی اصلیت وماہیت کا مختصر سا جائزہ لیتے ہیں۔

دونوں عربی کے مونث الفاظ ہیں۔ حیرت کے معنی گھبراہٹ اور پریشانی کے ہیں جبکہ حسرت میں افسوس اور تاسف کا مفہوم مخفی ہے جو کسی چیز کے نہ ملنے سے جنم لیتا ہے۔ تمنا، آرزو، ارمان اور شوق کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

حیران کن حالات وواقعات کی حیرت افزائی اِنسان کو حیرت زدہ اور حیران وپریشان کر دیتی ہے اور تحیر وگھبراہٹ کے اتھاہ سمندر میں ڈوب جاتا ہے اور اس کی حیرت زدگی کا عالم دیکھ کر اس کے بہی خواہ بھی دنگ اور سرگشتہ رہ جاتے ہیں۔ اور حسرت انگریز مرغوبات وتحریکات اِنسان کو حسرت سنجی کا عادی بنا دیتی ہے مگر جب اس کے ارمان پورے ہوتے ہیں اور اس کے دِل کی آرزوئیں دِل میں ہی رہ جاتی ہیں تو اس کا حسرت بھرا دِل اسے حسرت زدہ (ملول ومغموم) کے لقب سے ملقب کر دیتا ہے اور اس کی تمام حسرتیں دِل میں دفن ہو کر رہ جاتی ہیں اور تاسف کے سوا اس کے پاس کوئی چارہ باقی نہیں رہتا۔

مختصراً یوں سمجھیئے کہ حیرت کا تعلق دماغ سے ہے اور حسرت کا تعلق دِل سے ہے۔ حیرت ، سوچ اور فکر سے ظہور پزیر ہوتی ہے اور حسرت دِل میں جنم لیتی ہے جو کبھی کبھار پرورش پا کر پروان چڑھتی ہے اور اکثر دِل ہی دِل میں زندگی کا چکر لگا کر وہیں دفن ہو کر رہ جاتی ہے زبان اور چہرہ حسرت کے اظہار کا ذریعہ ہیں جبکہ حسرت کے برآنے یا اس کی تکمیل کا اندازہ کسی کے اعمال وافعال سے لگایا جا سکتا ہے۔

Marfat.com

حسرت کسی خواہش یا مقصد کے عدم حصول پر ہوتی ہے اور حیرت کسی امرِ واقع کی بوالعجبی پر ہوتی ہے مثلاً کسی کی غلط بیانی پر، وعدہ خلافی پر، متضاد قول و افعال پر، غیر متوقع نتائج پر یا توقعات کے برعکس نتائج پر۔ یہ دیکھنے سُننے اور پڑھنے پر اظہار کا باعث بنتی ہے جبکہ حسرت کے اسباب حسبِ ذیل ہیں:

i) خواہشات کا پورا نہ ہونا
ii) اُمیدوں پر پانی پھر جانا
iii) توقعات کا بر نہ آنا
iv) محرومیوں اور ناکامیوں پر اپنی بے بسی اور بے چارگی کے باعث
v) دوسروں کی خوشی و خرمی اور مرفہ الحالی کا اپنی بے بضاعتی کے تقابل سے مگر

بعض داناؤں کا یہ بھی کہنا ہے کہ رشک یا حسد حسرت کا اصل سبب ہیں لیکن غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ رشک و حسد میں بھی خواہش کا پہلو ہی مخفی ہوتا ہے لہٰذا خواہشات کی عدم تکمیل کو ہی حسرت کا حقیقی سبب قرار دینا قرینِ قیاس دکھائی دیتا ہے۔

بلاشبہ نفسیات کی رو سے حیرت اور حسرت فطری امر ہیں اور ان سے مفر ممکن نہیں۔ یہ دماغ اور دِل کے خاصے اور لوازم ہیں۔ ان کی حقیقت مسلّم ہے لہٰذا ان سے انکار اور فرار ممکن نہیں۔ جب تک جسم میں دماغ اور دِل موجود ہیں ان کی وقوع پزیری کا امکان ہر دم اور ہر قدم پر متوقع ہے مگر

ہمیشہ حیرت میں ڈوب جانا یا ڈوبے رہنا اور حسرتوں کے پیچھے پڑے رہنے یا حسرتوں سے دِل کو بھرے رکھنا کہاں کی عقلمندی ہے۔ ان دونوں کے استغراق سے بچنے کی ہر ممکن سعی کرتے رہیں لیکن ان سے واجبی واجبی سا تعلق بھی برقرار رکھنے کی کوشش کرتے رہیں۔ بس یہی میرا مشورہ ہے۔

Marfat.com

خاک اور خاکہ

خاک اور خاکہ ملتے جلتے الفاظ ہیں۔اُن کی مشابہت میں صرف "ہ" کا تفاوت ہے۔خاکہ کی "ہ" کو اگر حذف کر دیا جائے تو خاک رہ جاتا ہے اور اگر خاک میں "ہ" کا اضافہ کر دیا جائے تو وہ خاکہ بن جاتی ہے۔مگر

معنوی لحاظ سے دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔خاک کے معنی مٹی، راکھ اور زمین کے ہیں جبکہ خاکہ کے معنی نقشہ، ڈھانچا، منصوبہ یا شخصی حالات کا مختصر تذکرہ ہے۔یوں ان میں کوئی مناسبت نہیں ہے۔آیئے پہلے ہم خاک کی خبر لیتے ہیں پھر خاکہ کا حال پوچھیں گے:

سب سے پہلے خاک سے اِنسان کا ہیولا تیار کیا گیا پھر اس میں، روح ڈال کر آدمؑ کی تخلیق کی گئی۔یوں خاک کو اِنسانی عناصر اربعہ میں اولیّت کا شرف حاصل ہے گویا خاک اِنسان کی اصل ہے اس کا خمیر ہے جو مرنے کے بعد خاک میں مل کر پھر سے خاک ہو جاتا ہے سچ ہی تو کہا گیا ہے کہ "پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا"

خدا تعالیٰ نے اس خاکی پتلے کو اسماء کا علم سکھا کر اور اپنا نائب بنا کر دنیا میں اتارا اور اشرف المخلوقات کے لقب سے ملقب فرمایا مگر دنیاداری اور دنیا طلبی کی ہوس میں یہ عمر بھر خاک چھانتا رہتا ہے۔مطلب برآری کے لئے خاک پر لوٹتا ہے اور خاکساری سے کام لیتے ہوئے دوسروں کی خاک بھی چاٹتا ہے اور اپنے افعال و حرکاتِ قبیحہ سے نہ صرف اپنی خاک اڑاتا ہے بلکہ خاندانی نام و ننگ کو بھی خاک میں ملا دیتا ہے۔

خاک ماہیّت کے لحاظ سے مادہ ہے مگر خاصیّت کے لحاظ سے مختلف ہے اسی لحاظ سے مختلف فصلیں اگائی جاتی ہیں اور اس کے تجزیہ سے زیرِ زمین معدنیات کے دفینے اور خزینے دریافت کئے جاتے ہیں۔ساحلی زمین دلدلی، میدانی زمین زرخیز اور صحرائی زمین بے آب و گیاہ ہوتی ہے اور وہاں ہمیشہ خاک ہی اڑتی دکھائی دیتی ہے۔تاہم

خاک کہیں کی بھی اور کیسی بھی ہو خاک ہی کہلاتی ہے اور اس کی رنگت میں کم و بیش

Marfat.com

یکسانیت ہی پائی جاتی ہے مگر خصوصیات کے لحاظ سے اسے مختلف ناموں سے موسوم کیا جاتا ہے جیسے: خاکِ در، خاکِ وطن، خاکِ پاک، خاکِ پا، خاکِ کفِ پا، خاکِ مدینہ، خاکِ شفا وغیرہ۔ خاک شفا کی خاصیّت ملاحظہ ہو:

واہ ری رحمت دوزخ کو بھی ٹھنڈا کر دیا
آگ پانی ہوگئی خاکِ شفا کے سامنے

ہمارے لئے خاک کے سلسلے میں بس اتنا ہی یاد رکھنا کافی ہے کہ ہم خاک زاد ہیں۔ مرکرتۂ خاک میں ہی ہمارا ابدی ٹھکانہ ہے اس لئے ہمیں خاک بسر نہیں پھرنا چاہیئے اور بمصداق ''خاک نہ دھول بکائن کے پھول'' نہیں بننا چاہیئے بلکہ زندگی بسر کرتے ہوئے خاک نشین رہتے ہوئے خاک نہاد بننے کی سعی کرنا چاہیئے اور سفلی خواہشات، ایک دوسرے کی سہو و خطا اور عیبوں پر خاک ڈالنی چاہیئے۔

خاکہ دیکھی اور ان دیکھی اشیاء کی تصویر کشی ہے۔ یہ نثری بھی ہوتا ہے اور منظوم بھی۔ ادیب وشاعر کی منظر کشی مظاہر قدرت کا خاکہ ہی تو ہے۔ اسی طرح واعظ کا خدا، روح، فرشتے اور بہشت ودوزخ کا بیان بھی تو خاکے ہی ہیں۔ جنوں، پریوں اور بھوت پریت کے وجود کا احساس بھی تو ان کے خاکوں ہی میں متصوّر رہوتا ہے۔

بچے ڈرائنگ میں خاکے بنا کر ان میں رنگ بھرتے ہیں تو خاکے کا تشخص قائم ہوتا ہے جس سے مخفی صلاحیتیں عیاں ہوتی ہیں اور پوشیدہ راز کھلتے ہیں۔ بعینہٖ

خاکہ ایک تصویر ہوتا ہے جو دماغ میں سوچا جاتا ہے، دل میں بٹھایا جاتا ہے اور کاغذ پر بنایا جاتا ہے۔ زبان پر لایا جاتا ہے۔ تقریبوں میں پڑھا جاتا ہے اور کتاب کی شکل میں چھپوایا جاتا ہے۔

خاکہ نگاری ایک فن ہے اور خاکہ نگار ایک مصوّر رہوتا ہے جو نوکِ زبان وقلم سے کسی کی جیسی بھی چاہتا ہے تصویر کشی کرتا ہے۔ اس میں ظرافت کا نمایاں عنصر فنکار کا کمال سمجھا جاتا ہے۔ اس میں کسی شخصیت کے مختلف پہلوؤں اور عادات وکردار کے مختلف گوشوں کو خندہ پیشانی سے ظاہر کرنا بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اس کے لطف وتاثیر کا جواب نہیں ہوتا اور اس کا پڑھنے والا یقیناً محظوظ ہوتا ہے اور دادِ فن دیئے بغیر نہیں رہتا۔

Marfat.com

کسی تنظیم، ادارہ، محکمہ یا منصوبے کے آغاز کے وقت جو پروگرام وضع کئے جاتے ہیں انہیں بھی خاکے یا بنیادی ڈھانچے کہتے ہیں اور پھر جب اس کی بہتری کے لئے تنظیم نو کے وقت جو کہا جاتا ہے اسے بنیادی ڈھانچے میں تبدیلی کا نام دیا جاتا ہے جیسا کہ حکومت اکثر بیشتر کرتی رہتی ہے اور آج کل بالخصوص محکمہ پولیس میں کر رہی ہے یہاں تک کہ حکومت دہشت گردوں اور مفروروں کی گرفتاری کے لئے ان کے خاکے اخبارات میں بھی شائع کرواتی رہتی ہے۔

بلاشبہ اہلِ فن نے خاکہ نگاری کے کچھ اصول بنا رکھے ہیں اور اس کے لئے ضابطۂ اخلاق کی قدغن لگا رکھی ہے مگر خاکہ نگار کسی پابندی کا پابند نہیں ہوتا وہ ایک انشائیہ نگار کی طرح جس طرف چاہتا ہے اپنا رخ موڑ لیتا ہے اور جو چاہتا ہے کہہ گزرتا ہے۔ تاہم خاکہ نگاری اور انشائیہ نگاری میں ندرت اور شگفتگی کا عنصر ان اصناف کی پسندیدگی کا واحد جزو لازم ہے۔ چونکہ خاکہ اور انشائیہ میں شگفتہ بیانی سے کام لیا جاتا ہے اس لئے انہیں ہلکا پھلکا سمجھا جاتا ہے مگر وزن میں یہ ہرگز ہلکے پھلکے نہیں ہوتے۔

آپ جس کا چاہیں بے شک خاکہ بنائیے، کھینچئے یا اتاریئے مگر خاکہ اڑانے سے ضرور اجتناب برتیئے تاکہ کسی کی دِل آزاری نہ ہو۔

Marfat.com

خراش اور خلش

خراش اور خلش ایرانی نژاد بہنیں ہیں۔خراش چھوٹی اور خلش بڑی ہے۔چھوٹی ظاہر دار اور بڑی باطن پرست ہے۔خراش نمود کی قائل ہے اور خلش پردہ دار ہے مگر چبھن کی قدر دونوں میں مشترک ہے۔خراش جب نمودار ہوتی ہے تو اپنے خلاف ناپسندیدگی کو جنم دیتی ہے اور خلش باطن کے پردے میں مخفی رہنے کے باوجود اندر ہی اندر گھن اور دیمک کی طرح چاٹتی رہتی ہے۔

خراش رگڑ، زخم کی ہلکی سی لکیر اور کھجلی کے معنی دیتا ہے جبکہ خلش کھٹک، رنجش اور بغض و نزاع کے مفاہیم رکھتا ہے۔

کانٹے اور زخم کی خراش معمولی خراشیں سمجھی جاتی ہیں جو جلد مٹ جاتی ہیں۔بچھو، سانپ اور دیگر موذی جانوروں کی کاٹ کی خراش خطرناک اور مہلک خراشیں ہوتی ہیں جبکہ واقعاتی اور حادثاتی طور پر آنے والی خراشیں قابلِ فراموش ہوتی ہیں مگر دِل کو صدمات سے جو خراشیں پہنچتی ہیں وہ نا قابلِ برداشت ہوتی ہیں اور بھلائے بھی نہیں بھولتیں ان کی چبھن کا احساس بڑا دیرپا، کربناک اور دِل خراش ہوتا ہے۔

کہتے ہیں کہ خلش تو خار کی بھی برداشت نہیں ہوتی چہ جائیکہ دِل و دماغ کی _____ اور جب دِل مین کوئی کانٹا چبھ جائے تو اس کا گھاؤ بڑا گہرا ہوتا ہے اور دماغ کا کانٹا تو ہمیشہ کے لئے وہیں اٹک کر رہ جاتا ہے _____ دونوں کانٹے بڑے اذیت ناک اور خطرناک ہوتے ہیں _____

خلش کا تعلق صرف سوچ اور احساس سے ہوتا ہے اور جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ سوچ کا تعلق دماغ سے ہے اور احساس کا تعلق دِل سے لہٰذا انہی تعلقات کی بنا پر اس کی دو قسمیں دِلی اور دماغی وجود میں آتی ہیں۔یہ دِل و دماغ میں پیدا ہوتی ہیں وہیں پلتی بڑھتی ہیں اور وہیں دفن ہو جاتی ہیں۔

خراش زدہ مریض کو آپ "مخروش" کا نام دے سکتے ہیں جبکہ مبتلائے خلش کو آپ "مخلوش" کہہ سکتے ہیں۔مخروش کے ساتھ ہر کوئی ہمدردی جتاتا ہے جبکہ مخلوش آدمی اپنے ہی آپ میں

Marfat.com

رہتا ہے، دوسروں سے پہلو تہی کرتا ہے اور اپنے مرض کو چھپانے کی کوشش میں اندر ہی اندر کڑھتا ہے اور پیچ و تاب کھاتا رہتا ہے۔ تنہائی کو باعثِ سکون خیال کرتا ہے مگر اس کا یہ خیال خام ہے کیونکہ تنہائی میں سوچ اور احساس میں فطری طور پر اضافہ ہو جاتا ہے جسے وہ محسوس نہیں کر پاتا اور یوں اس کا مرض روز بروز طویل اور لاعلاج ہوتا جاتا ہے۔ وہ اپنے مرض اور دکھ کا اظہار بھی نہیں کرتا کیونکہ وہ خلش کے روگ کو عشق کے روگ کی طرح لاعلاج تصوّر کرتا ہے اور کسی کو اپنا غمگسار اور چارہ ساز نہیں سمجھتا اور اگر وہ کسی کو دوست اور رازدان جان کر اپنا حالِ دِل کہہ بھی دے تو کیا حاصل؟ وہ عاشق زار کی طرح اتنا بے خود اور بے خبر ہوتا ہے کہ وہ خلش کے اسباب و علل جاننے اور اس کے علاج معالجہ کے سلسلے میں نہ کچھ کہہ سکتا ہے اور نہ کچھ کر سکتا ہے۔ اس کا بس خدا تعالیٰ ہی حافظ ہے _____ خدا تعالیٰ ہی ہے جو اس کے دِل و دماغ میں "احساسِ زیاں" پیدا کر دے یا پھر بذریعہ موت اسے اس موذی مرض سے نجات عطا کر دے _____

خلش حسد، رشک یا عداوت سے پیدا ہوتی ہے جس کا اثر دِل و دماغ پر برابر اور مسلسل پڑتا ہے۔ اس سے دِل میں آتش انتقام بھڑکتی ہے جسے دماغ مزید ہوا دے کر بروئے کار لاتا ہے اور اِنسان کچھ بھی کر گزرتا ہے جس کے نتائج اکثر بھیانک صورت اختیار کر کے زندگی کو طرح طرح کے مصائب و آلام سے دوچار کر دیتے ہیں مگر خلش پھر بھی نہیں مٹتی۔

خراش اور خلش کی باہمی مشابہت اور مناسبت کی وجہ سے انہیں جسمانی عوارض بھی کہا جا سکتا ہے خراش کا علاج وید، حکیم اور ڈاکٹر کر سکتے ہیں مگر خلش کا علاج کسی کے پاس نہیں۔ خراش کی لکیریں اکثر مٹ بھی جاتی ہیں اور کچھ باقی بھی رہ جاتی ہیں جو بے ضرر ہوتی ہیں مگر خلش کی دراڑیں انمٹ ہوتی ہیں اور اس کے نشان دِل و دماغ پر نہ صرف نقش رہتے ہیں بلکہ ہمیشہ مسلط بھی رہتے ہیں۔ ان کا علاج تحمل اور برداشت تجویز کیا جاتا ہے مگر اِنسانی فطرت کے مطابق ناقابلِ قبول اور ناقابلِ عمل ہے البتہ رفت گزشت اور عفو و درگزر سے حسد و رشک، بغض و عناد اور جذبۂ انتقام کی آتش فروزاں کو ٹھنڈا کر کے امن اور سلامتی کی راہ نکالی جا سکتی ہے۔

دعا ہے کہ ربِّ اعلیٰ ہمیں ہر طرح کی دِل خراشیوں اور خلش سامانیوں سے محفوظ و مصئون رکھے اور امن و سلامتی سے زندگی بسر کرنے کی رہنمائی فرمائے۔ آمین

Marfat.com

خواب اور خیال

خواب حقیقت ہے اور خیال وہمہ ہے۔ عام لوگ خواب اور خیال کو ہم معنی سمجھتے ہیں مگر ایسا نہیں ہے کیونکہ خواب کا تعلق نیند سے ہے اور خیال کا تعلق سوچ سے۔ خواب سوتے میں دیکھا جاتا ہے اور خیال جاگتے میں آتا ہے مزید یہ کہ خیال محض مخفی خیال ہے مگر خواب خیال کی طرح ہرگز خیالی نہیں ہے۔ خواب تو الہام کی ایک صورت ہے جس میں حق تعالیٰ فرشتے کو حکم دیتا ہے کہ وہ اس کے بندے کو خواب میں الہام کرے تا کہ وہ صدقہ دے اور گناہ سے بچے۔ سچا خواب تو وحی الٰہی اور جزو نبوت ہے۔ حضور پاک ﷺ کے فرمان کے مطابق سچا خواب تو نبوت کا 46 واں حصہ ہے وراس کی حقیقت وصداقت کی یوں تصدیق فرمائی کہ ''میری وفات کے بعد وحی تو ختم ہو جائے گی مگر مبشرات بند نہ ہوں گے''

خیال اچھا بُرا اور ادنیٰ واعلیٰ بھی ہوسکتا ہے جس کا اندازہ صرف اس کی عملی صورت میں ہی ہوسکتا ہے مگر خواب نہایت اعلیٰ وافضل شے ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو حضرت ابراہیمؑ خواب کی بنا پر اپنے لختِ جگر کو ذبح کرنے کے لئے تیار نہ ہوتے۔ اس کی حقیقت رسول اکرمؐ کے اس ارشاد پاک سے بھی عیاں ہوتی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''جس نے مجھے خواب میں دیکھا اس نے مجھے ہی دیکھا کیونکہ شیطان میری صورت نہیں بنا سکتا'' تاہم خواب کی ایک قسم مکروہ بھی ہے جس میں اِنسان شیطانی حرکات، خوفناک مناظر اور اقدامات وتحریکات، کاربد اور عصیاں کاری کا مشاہدہ کرتا ہے مگر اس کے اثراتِ بد سے محفوظ رہنے کے لئے حضور اکرمؐ نے ایک عظیم نسخہ عطا فرمایا ہے کہ ''جب کوئی شخص مکروہ خواب دیکھے تو تین مرتبہ بائیں کروٹ لے کر تھُف کر کے اعوذ پڑھے اور کسی کو نہ بتائے۔''

جہاں تک خواب کی تعبیر کا تعلق ہے تو اس کی حقیقت سے بھی انکار جائز نہیں۔ سچے خواب تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بشارتیں ہوتی ہیں ان کی تعبیر ایرے غیرے سے نہیں پوچھنی چاہیئے کیونکہ تعبیر پوچھنا نہایت نازک اور خطرناک بات ہے کیونکہ بتائی گئی تعبیر بحکم خداوندی واقع ہو جاتی

Marfat.com

ہے۔بقول حضرت امام جعفر صادقؒ چار قسم کے اشخاص سے خواب کی تعبیر پوچھنا ناجائز ہے

۱) بے دین سے جو شریعت کے پابند نہ ہوں۔
۲) عورتوں سے جو ناقص العقل ہوتی ہیں۔
۳) جاہلوں سے جو علم دین سے نابلد ہوتے ہیں۔
۴) دشمنوں سے جو خیر و برکت سے خالی ہوتے ہیں۔

لہٰذا

ضروری ہے کہ خواب صرف مخلص دوست، نیک، صالح، عالم باعمل اور برگزیدہ ہستیوں کے سوا کسی سے بیان نہ کیا جائے کیونکہ یہ علم خداوندی ہے اور عطیہ الٰہی ہے۔ارشادِ ربانی ہے کہ

"اے یوسفؑ ہم نے تجھے خواب کی تعبیر کا علم سکھایا_____ اور برگزیدہ فرمایا"

حضرت یوسفؑ کے بعد علمِ تعبیر کا جو مقام امام محمد بن سیرینؒ کو حاصل ہے کسی دوسرے ولی یہاں تک کہ کسی صحابی کو بھی نہیں۔انہیں تعبیرِ خواب کا غیر معمولی جوہر ودیعت کیا گیا تھا۔آپ نے خواب کی تین اقسام بتائی ہیں:

۱) حدیث نفس (دلی خیالات) یعنی اپنے کام یا پیشہ کے متعلق خواب میں متعلقہ چیزیں دیکھنا۔
۲) تخویفِ شیطان (مکروہ، بُرے اور متوحش خواب) جن کی تعبیر تین مرتبہ بائیں طرف تھوکنے اور شیطان سے پناہ مانگنے سے الٹ جاتی ہے۔
۳) مبشراتِ خداوندی (خدائی بشارتیں) یہی خواب سچے اور قابلِ تعبیر ہوتے ہیں اور پہلی دو اقسام کے خواب درخور التفات نہیں ہوتے۔

تعبیرِ خواب کے ضمن میں امام موصوف کا یہ قول بھی ہے کہ رات کے پہلے حصے میں دیکھے گئے خواب کی تعبیر پانچ سال میں ظاہر ہوتی ہے۔آدھی رات میں دکھائی دینے والے خواب کی تعبیر پانچ مہینوں تک ظہور پزیر ہوتی ہے اور رات کے آخری حصے یعنی صبح سویرے جو خواب دکھائی دے تو اس کی تعبیر دس روز تک ظاہر ہو جاتی ہے۔

حضرت مغربیؒ نے خواب کی دو قسمیں بیان کی ہیں_____ ایک سچا خواب اور دوسرا جھوٹا_____ اور سچا خواب تین قسم پر ہے۔ایک بشارت دوسرا تنبیہ اور تیسرا الہام۔یاد رہے کہ خواب فرزند آدم کے سر پر آنے والی نیکی اور بدی کی ایک اطلاع ہے جو حق تعالیٰ کی طرف سے

Marfat.com

خواب کے فرشتے (ملک الرویا) کے ذریعے سے دی جاتی ہے۔ مگر
عوام الناس اور اہلِ زبان کے ہاں خواب وخیال کے جو تصوّرات ہیں وہ محض خواب اور خیال کی باتیں ہیں مثلاً خواب کے ضمن میں:

۱) خواب خرگوش یا خواب غفلت: تغافل اور بے خبری کے معنوں میں۔
۲) خواب سنگین یا خواب گراں: گہری نیند کے لئے۔
۳) خواب شیریں یا خواب نوشیں: میٹھی اور پر لطف نیند کے لئے۔
۴) خواب پریشاں: بے آرامی کی نیند یا ڈراؤنا خواب۔

اسی طرح خیال کے ضمن میں:

۱) خیال خام: پورا نہ ہونے والا تصوّر۔ بے ہودہ خیال۔
۲) خیال بد: بُری سوچ۔
۳) خیال فاسد: فساد پیدا کرنے والا خیال۔
۴) خیالی بندی: خیالی تصویر۔

غرض ان کے سب خواب وخیال خیالی اور تصوّراتی ہیں۔ مختصراً یہی کہا جا سکتا ہے کہ ان کے خواب خیال آور اور خیال خواب آلودہ ہوتے ہیں جن سے چھٹکارا پانے کا واحد علاج خواب آور گولیاں ہیں جن سے نہ انہیں خواب کا خیال رہے نہ کسی خیال کا خواب دیکھیں بلکہ سب کچھ فراموش کر دیں۔

خواب وخیال کی اس خیال بندی کے بعد آپ کو میرا یہی مشورہ ہے کہ خیالی خوابوں اور خواب آلودہ خیالوں سے بچیں اور جیسے تیسے بھی بن پڑے ایسے ویسے خوابوں کا خیال چھوڑیں اور ایسے ویسے خیالوں کے خواب نہ دیکھا کریں اور اگر خواب وخیال کو دیکھنا ہی ہے تو اِسلامی تناظر میں دیکھیں۔

Marfat.com

خوب تر اور بدتر

خوب اور بد فارسی کے متضاد الفاظ ہیں اور بطور صفت استعمال ہوتے ہیں۔ "خوب" اچھا اور "بد" بُرا کے معنی دیتا ہے۔ ان سے اچھائی بُرائی اور نیکی بدی کا مفہوم بھی لیا جاتا ہے۔ بطور سابقہ استعمال کرنے سے جو مرکبات توصیفی بنتے ہیں ان میں بھی اچھائی اور بُرائی کا پہلو ہی اجاگر ہوتا ہے جیسے خوب سے خوبصورت، خوبرو وغیرہ اور بد سے بدصورت، بدچلن وغیرہ مگر جب ان کے ساتھ "تر" کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے تو ان کی صفت میں اضافہ ہو جاتا ہے (اُردو میں "تر" کے بجائے "بہت" آتا ہے جسے گرامر کی اصطلاح میں "تفضیل بعض" کہتے ہیں) ہم اسی تفضیل بعض کو ذرا تقابلی تناظر میں دیکھنا چاہتے ہیں۔

خوب

زکوٰۃ و خیرات دینا خوب ہے مگر خوش دِلی سے دینا خوب تر ہے۔
امیر کا بخشش کرنا خوب ہے لیکن محتاج سے خوب تر ہے۔
تواضع غریبوں سے خوب ہے لیکن امیروں سے خوب تر ہے۔
بڑھاپے میں توبہ خوب ہے مگر جوانی میں خوب تر ہے۔
گناہ سے توبہ کرنا خوب ہے مگر بچنا خوب تر ہے۔
اگرچہ شرم مردوں سے خوب ہے مگر عورتوں سے خوب تر ہے۔
مصیبت میں صبر خوب ہے لیکن صبر کے ثواب کو ضائع نہ ہونے دینا خوب تر ہے۔
نیکی کرنا خوب ہے لیکن اس کے ثواب کو ضائع نہ ہونے دینا خوب تر ہے۔
نیکی کا اجر دنیا میں خوب ہے مگر آخرت میں خوب تر ہے۔
حصول علم خوب ہے لیکن اس پر عمل کرنا خوب تر ہے۔
حفاظتِ جان خوب ہے لیکن حفاظت ایمان خوب تر ہے۔
غصّے پر قابو پانا خوب ہے مگر غصّے میں نہ آنا خوب تر ہے۔

Marfat.com

معافی مانگنے پر معاف کر دینا خوب ہے لیکن بن مانگے معاف کرنا خوب تر ہے۔
کچھ مانگنے پر ملنا خوب ہے مگر بن مانگے ملنا خوب تر ہے۔
سچ بولنا خوب ہے مگر سچی گواہی دینا خوب تر ہے۔
خوئے خوباں خوب ہے لیکن خوئے نیکاں خوب تر ہے۔
جبر کرنا خوب ہے لیکن صبر کرنا خوب تر ہے۔
میدان جیتنا خوب ہے لیکن دِل جیتنا خوب تر ہے۔
شہد کی مٹھاس خوب ہے لیکن زبان کی مٹھاس خوب تر ہے۔
تحفظ جان خوب ہے لیکن تحفظ آبرو خوب تر ہے۔
بھلا ہونا خوب ہے لیکن بھلا چاہنا خوب تر ہے۔
اچھا رہنا خوب ہے لیکن اچھا کرنا خوب تر ہے۔
اچھی سننا خوب ہے لیکن اچھی کہنا خوب تر ہے۔
اطمینان خوب ہے لیکن یقین خوب تر ہے۔

بد

اگر چہ گناہ جوانی میں بھی بد خیال کیا جاتا ہے لیکن بڑھاپے میں بدتر سمجھا جاتا ہے۔
چوری چھپے گناہ بد ہے لیکن سرِ عام بدتر ہے۔
تکبّر کرنا امیروں کا فعلِ بد ہے لیکن محتاجوں کا بدتر ہے۔
فرائض اور عبادت میں سستی عام لوگوں سے بد ہے لیکن عالموں سے بدتر ہے۔
چغلی کھانا اور جھوٹ بولنا بد ہے لیکن تہمت و بہتان لگانا بدتر ہے۔
بداخلاقی بد ہے لیکن بداعمالی بدتر ہے۔
بداطواری بد ہے لیکن بداندیشی بدتر ہے۔
لادینی بد ہے لیکن بے دینی بدتر ہے۔
بے یقینی بد ہے لیکن بدیقینی بدتر ہے۔
بے اعتمادی بد ہے لیکن بداعتمادی بدتر ہے۔
بے ادبی بد ہے لیکن بدلحاظی بدتر ہے۔

Marfat.com

بے ذوقی بد ہے لیکن بد ذوقی بدتر ہے۔
بے رنگی بد ہے لیکن بد رنگی بدتر ہے۔
جدائی بد ہے لیکن تنہائی بدتر ہے۔
کج خلقی بد ہے لیکن کج روی بدتر ہے۔
غیرت کے نام پر قتل بد ہے لیکن کاروباری بدتر ہے۔
بدظنی بد ہے لیکن بد باطنی بدتر ہے۔
بدخلقی بد ہے لیکن بدخوئی بدتر ہے۔
بداخلاقی بد ہے لیکن بدزبانی بدتر ہے۔
بداسلوبی بد ہے لیکن بدخواہی بدتر ہے۔
بددہنی بد ہے لیکن بدراہی بدتر ہے۔
بے اصولی بد ہے لیکن بداصولی بدتر ہے۔
بدمتی بد ہے لیکن بدمعاشی بدتر ہے۔
بدنظری بد ہے لیکن بدنیّتی بدتر ہے۔
بدخوری بد ہے لیکن بدہضمی بدتر ہے۔
بدخطی بد ہے لیکن بدعہدی بدتر ہے۔
مجبوری بُری ہے لیکن کمزوری بہت بُری ہے۔
بُری صحبت بُری ہے لیکن بُری مت بہت بُری ہے۔
بُری چال بُری ہے لیکن بُری زبان بہت بُری ہے۔
بے مُروّتی بُری حرکت ہے لیکن لاتعلقی بہت بُری ہے۔
دکھ بُری شے ہے لیکن دکھ بھری زندگی بہت بُری ہے۔
طلب بُری بلا ہے لیکن لالچ بہت بُری ہے۔
نشہ بُرا ہے لیکن نشہ کی عادت بہت بُری ہے۔
زخم بذاتِ خود بُرا ہے لیکن زخموں پر نمک چھڑکنا بہت بُرا ہے۔
احسان اٹھانا بُرا ہے لیکن احسان جتانا بہت بُرا ہے۔

Marfat.com

بُرا جاننا بُرا ہے لیکن بُرا چاہنا بہت بُرا ہے۔
بُرا بھلا کہنا بُرا ہے لیکن بُرا بھلا کرنا/ کروانا بہت بُرا ہے۔
تارے گننا بُرا ہے لیکن پیسے گننا بہت بُرا ہے۔
فریب کھانا بُرا ہے لیکن فریب دینا بہت بُرا ہے۔
ڈرنا بُرا ہے لیکن ڈرانا بہت بُرا ہے۔

خوب و خوب تر اور بد و بدتر کے اس تقابلی جائزہ سے یہ بات با آسانی ذہن میں متبادر ہوتی ہے کہ اوّل الذکر قابلِ قبول ہے اور مؤخر الذکر قابلِ تردید ہے لیکن بزبانی حالی یہی قابلِ عمل ہے کہ

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
اب ٹھہرتی ہے دیکھئے جا کر نظر کہاں

Marfat.com

خوشی اور غم

خوشی خوش قسمتی کی علامت ہے۔ یہ عطیہ خداوندی ہے اور قسمت سے ہی ملتی ہے۔ قدرت نے کائنات میں خوشی کی بے شمار علامتیں تخلیق کی ہیں اور اِنسان اِن علامتوں پر فکر و تدبر کی بدولت خوشی کے حصول کو ممکن بنا سکتا ہے۔

خوشی کی تین قسمیں ہیں _____ ذہنی، دِلی اور نفسانی _____ ذہنی خوشی سب سے اولیٰ ہے، دِلی خوشی یقین و اطمینان کا باعث ہے اور نفسانی خوشی اگر تو فطری ہو تو باعثِ برکت ہے اور اگر غیر فطری ہو تو قابلِ مذمت ہے۔

خوشی ایک راز ہے، ایک بھید ہے جو مختلف صورتوں میں پنہاں ہوتا ہے۔ اس کی خفیہ صورتوں کو جاننا اور پہچاننا اِنسانی عقل و فکر کا محتاج ہے۔ جو اس کے رازوں کو پالیتا ہے وہی اِنسان خوش و خرم رہتا ہے اور دنیاوی و اخروی کامیابیوں سے ہمکنار ہوتا ہے۔

دیکھئے صوفیاء کے ارشاد کے مطابق خوشی کا مخفی راز ایک سادہ سے مقولہ میں کس خوبصورتی سے عیاں ہو رہا ہے کہ

"خوشی خوشدلی کا نام ہے"۔ بقول شاعر:

خوشی خوشدلی کا نام ہے مردہ دِل کیا خاک جیا کرتے ہیں

اگر کسی اِنسان نے دنیا میں خوش اور کامیاب ہونا ہے تو وہ کسی بات کا بُرا نہ منائے۔ اسی راز کو ایک یورپی مفکر جیرالڈ جمپوسکی نے اپنے ان خوبصورت الفاظ میں یوں کہا ہے اور کیا خوب کہا ہے:

"Forgiveness is a key to happiness"

یعنی درگزر خوشیوں کی چابی ہے۔

دنیاداروں کا کہنا ہے کہ خوشی خوشحالی کا دوسرا نام ہے اور خوشحالی دولت کی بدولت مگر دولت بذاتِ خود ایک پرچھائیں ہے جو بڑھتی ڈھلتی رہتی ہے، اسے قرار اور سکون نہیں، اس کا قیام عارضی ہے لہٰذا اس سے حاصل شدہ خوشیاں بھی عارضی اور فانی ہیں انہیں مداومت حاصل نہیں اور حقیقت

Marfat.com

یہ ہے کہ دولت حرص وآرزو میں اضافہ کرتی ہے جو سکون کے بجائے بے سکونی اور پریشانی کا باعث بنتی ہے اور حقیقی خوشی معدوم ہو کر رہ جاتی ہے مرزا غالب نے کہا ہے:

نہ لٹتا دن کو تو کیوں رات کو یوں بے خبر سوتا
رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں راہزن کو

خوشی کے حصول کی خاطر دیکھئے حضرت علیؓ کا یہ قول کتنا زرّیں ہے کہ

"اے اِنسان! اگر تو دنیا میں خوش رہنا چاہتا ہے تو اپنی خواہشات کو کم کر دے"

خوشی غم کا متضاد ہے اور مسرت وانبساط کا مترادف ہے خوشی کا احساس اور اس کی پہچان غم کے وجود سے ہے اس لئے متضاد ہونے کے باوجود ان کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔ یہ جڑواں ہیں جس کی تصدیق بقول شاعر یوں ہوتی ہے:

خوشی و غم جہاں میں توام ہے

یہ اور بات ہے کہ خوشی خوش نصیبوں سے ملتی ہے اور غم زندگی کا جزو لاینفک ہے جس سے بجز مرگ چھٹکارا نہیں بزبانِ غالب سچ ہی تو ہے کہ

موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

غم اِنسانی زندگی کی آبرو بھی ہے اور آزمائش بھی۔ غم کی آزمائش سے عہدہ برآ ہونے کے لئے بہت بڑے ظرف کی ضرورت ہوتی ہے۔ اِنسان ازل سے غم کا شاکی اور مسرت وشادمانی کا متلاشی رہا ہے۔

غم ایک ایسی بلائے ناگہانی ہے جس سے اِنسان کو اکثر واسطہ پڑتا رہتا ہے اور اسے اِنسان کو بہر صورت سہنا ہی پڑتا ہے۔ حقیقت غم کا شعور رکھنے والے دانشور غم کو لازمۂ حیات سمجھتے ہیں۔ شعراء حضرات میں چونکہ یہ حس نسبتاً زیادہ ہوتی ہے اس لئے وہ حقیقت غم کا بلند شعور رکھتے ہیں اس لئے وہ غم کو چاہے وہ غم حیات ہو، غم دوراں ہو یا غم جاناں، رسوا کرنا بدترین عیب سمجھتے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اگر یہ نہ ہو یا کم ہو جائے تو پھر زندگی کا مزا نہیں رہتا۔ بقول غالب:

قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

مگر اس کے برعکس اکثر شاعر جو غم کے شاکی ہیں انہوں نے اپنی شاعری میں حزن

Marfat.com

وملال اور رنج وغم کا جو مرقع پیش کیا ہے اس سے انہوں نے حیاتِ اِنسانی میں یاسیّت اور قنوطیّت کا فلسفہ بھر دیا ہے۔

غم ایک مرض ہے جسے لا علاج سمجھا جاتا ہے مگر بمصداق اس کے کہ ''لوہے کو لوہا ہی کاٹتا ہے'' اس درد کا مداوا بھی درد ہی سے ممکن ہوتا ہے۔اس مرض کا نسخہ ''موت'' ہے بقول غالب:

غم ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج

مگر کوئی بھی شخص اپنی جان سے موت کا رشتہ وابستہ کرنا نہیں چاہتا۔

غم ضبط کرنے کے لئے کھیل، تفریح یا مطالعہ ضروری ہے مگر اس کا واحد علاج مسکراہٹ ہے۔صرف مسکرا کر ہی اسے ختم کیا جاسکتا ہے اور غصّہ کی آگ کو پانی پی کر ٹھنڈا کیا جاسکتا ہے۔

خوشی اور غم کی اس مبحث سے یہی متبادر ہوتا ہے کہ خوشی بانٹنے سے بڑھتی ہے اور غم بانٹنے سے کم ہوتے ہیں مگر اس حقیقت کے باوصف غم غم ہی ہے اور خوشی خوشی ہے۔غم کو چھاتی سے لگا کر سہنے کی تاب رکھنی چاہیئے اور خوشی میں غم کو فراموش نہیں کرنا چاہیئے کیونکہ دونوں ناگزیر ہیں اور دونوں گزشتنی ہیں۔رہے نام اللہ کا_____

Marfat.com

خوف اور خطرہ

خوف اور خطرہ دو جڑواں بھائی ہیں جو ایک ساتھ پیدا ہوتے ہیں ایک ساتھ بڑھتے پھولتے ہیں اور ایک ہی ساتھ ختم ہو جاتے ہیں۔ ایک ٹکٹ میں دو مزے ہیں۔ خوف سے خطرہ بڑھتا ہے اور خطرے سے خوف میں اضافہ ہوتا ہے۔

خوف اور خطرے سے خدشات بڑھتے ہیں اور خدشات جب دِل و دماغ میں گھر کر لیتے ہیں تو صورت حال بڑی بھیانک اور مہلک ہو جاتی ہے اعصابی تناؤ، دِل کی دھڑکن اور فشارِ خون بڑھ جاتا ہے اور خطرناک بیماریاں جنم لیتی ہیں اور خوفناک قسم کی طویل پریشانیوں کا موجب بنتے ہیں۔ جسم کا دماغی نظام درہم برہم ہو جاتا ہے اور سوچ و فکر کی صلاحیتیں مسلوب ہو جاتی ہیں۔

خوف اور خطرہ بے ناک ہیں۔ ناک لگنے سے یہ خوفناک اور خطرناک بن جاتے ہیں مگر بے لگنے سے ان کی خطرناکی ختم ہو جاتی ہے اور اِنسان بے خوف و خطر ہو کر المناک کارنامے بھی کر گزرتا ہے اور ہوشربا کام بھی سرانجام دیتا ہے۔ قتل و غارت گری اس کے المناک کاموں کی انتہا ہے اور اس کے ہوشربا کارناموں کی معراج بقول شاعر عقل کو یوں حیران کر دیتی ہے کہ

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق　　عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی

خوف اور خطرہ انجانے بھی ہوتے ہیں اور جانے بوجھے بھی۔ جانے بوجھے شعوری اور قابلِ اصلاح و علاج ہوتے ہیں مگر انجانے اور لاشعوری اور لاعلاج ہوتے ہیں کیونکہ لاشعور میں جب یہ اپنا گھر بسا لیتے ہیں تو کوئی طاقت انہیں اس گھر سے باہر نہیں نکال سکتی اور یوں یہ مہلک اور جان لیوا ثابت ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر ہربرٹ بیسن کی تحقیق کے مطابق دوسری جنگِ عظیم میں 15 فیصد لوگ صرف خوف سے مر گئے تھے یعنی نہ انہیں کوئی بیماری تھی اور نہ انہیں کوئی زخم ہی لگا تھا۔ آسٹریلیا کے ڈاکٹر بارتھراپ کا کہنا ہے کہ خوف سے ذہن اس قدر پریشان اور نظامِ ہضم اس قدر خراب ہو جاتا ہے کہ اِنسان آسانی سے بیمار ہو جاتا ہے۔

خوف ہو یا خطرہ ہر دو گھبراہٹ اور پریشانی کا موجب ہیں۔ مگر الف والے خطرے (یعنی

Marfat.com

خطرا) سے آپ کو کوئی خوف اور خطرہ نہیں کیونکہ یہ خطرا خاطر کی تصغیر بالتحقیر ہے مگر یائے مغیرہ ہ دو خطروں (خطرہ اور خطرا) میں مختلف مفاہیم رکھتی ہے "مثلاً خطرے میں ڈالنا" کے معنی آفت میں پھنسانا ہے اور "خطرے میں نہ لانا" کا مطلب خاطر میں نہ لانا یا حقیر سمجھنا کے ہیں۔

بلاشبہ خوف وخطرات آفتِ جاں بھی ہیں۔ یہ فطرت اور زندگی کے تلازم ہیں ان کے فر سے نہیں مگر حقیقت پسندی اور حقیقت شناسی کا تقاضا یہی ہے کہ خوف یا خطرہ چاہے کسی قسم ہو (دشمن کا، مخالف کا، آفت کا، جان کا، مال کا وغیرہ وغیرہ) اس سے گھبرانا یا پریشان نہیں چاہیئے بلکہ ہمت، استقلال، تدبر، حکمت اور جوانمردی سے بلا خوف وخطر اس کا سامنا رنا چاہیئے۔ یہی بہادری اور دانشمندی ہے۔

خوف اور خطرہ کی خوفناکیوں اور خطرناکیوں کے ذکر کے بعد ان کے خدشات وتحفظات کے بیان کے آخر میں میں ایک ایسے خوف کی طرف آپ کی توجہ مبذول کروانا چاہوں گا جو میری تحریر کا اصل مدعا ہے اور یہ خوف بڑا ہی مستحسن اور متبرک ہے اور وہ ہے "خوفِ خدا" یہ خوف بڑا ہی برکتوں اور رحمتوں والا ہے۔ اس خوف کو اگر دل ودماغ میں سمولیا جائے تو دنیا جہان کے خوف و خطرات نیست ونابود ہوجاتے ہیں ان کا وجود اور احساس تک معدوم ہوجاتا ہے ہر طرح کے خوف وخطرات مٹ جاتے ہیں۔ انسانی ذہن آسودگی حاصل کرتا ہے۔ دنیاوی زندگی آسودہ اور پُرسکون ہوجاتی ہے اور اس کا ابدی فائدہ یہ ہوتا ہے کہ عاقبت بھی سنور جاتی ہے۔

ہم خیالوں کی یکجائی کامیابی کا پیش خیمہ ہوتی ہے جبکہ مخالفوں کا گٹھ جوڑ خطرے کی گھنٹی ثابت ہوتا ہے۔

خوف اور خطرہ سوچ اور فکر کی پیداوار ہوتے ہیں اور یہ ہر شئے پر محیط ہوتے ہیں۔ زندگی انہی کے محور پر گھومتی ہے۔ قدم قدم پر ان کے الارم بجتے ہیں۔ ایک ٹلتا ہے تو دوسرا چھا جاتا ہے۔ اولاد کو ماں باپ کا خوف ان کی ذہنی اور جسمانی نشوونما میں حائل ہوتا ہے۔ طالب علم کو اس کے استاد کی تہدید وسزا کا خوف پریشان کرتا ہے۔ قانون کا احترام کرنے والے کچھ نہیں کرپاتے اور جرائم پیشہ لوگ پولیس سے چھپ چھپا کر اپنا دھندہ کرتے ہیں۔ قانون اور سزا کے خوف سے بے نیاز ہو کر وہ موت کے خطرے مول لیتے رہتے ہیں۔

حصول مراد اور کامیابی کے لئے بھی طرح طرح کے خطرات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔

Marfat.com

خطرات نجی نوعیت کے بھی ہوتے ہیں، اجتماعی، گروہی، قومی اور بین الاقوامی بھی۔ یہاں تک کہ زمینی اور فلکی بھی اور آج کل تو کرّہ ارض کو آلودگی سے درپیش خطرات کا جو زبردست سامنا ہے اس سے زمینی، جنگلی، آبی اور فضائی حیات کو جان کے لالے پڑے ہوئے ہیں اور ان کے تحفظات کے اہم مسئلہ کے حل کے لئے جغرافیہ دان اور سائنسدان بڑے پریشان اور بے بس دکھائی دے رہے ہیں۔

بس مختصر بات یہ ہے کہ اگر آپ اپنی صحت اور جان کی خیر وسلامتی چاہتے ہیں تو کسی قسم کے خوف کو اپنے دل و دماغ میں جگہ نہ دیجئے اور کوئی خطرہ خود سے مول نہ لیجئے۔ اور اگر خدانخواستہ کبھی آپ پر کوئی خوف طاری ہو ہی جائے اور آپ خطرات میں گھر ہی جائیں تو دل و دماغ کو قائم رکھیئے حوصلہ نہ ہاریئے اور پورے عزم و استقلال سے ان کا مقابلہ کیجئے یقیناً فتح آپ ہی کی ہوگی میری نظر میں امید اور صرف امید ہی وہ نسخۂ کیمیا ہے جو ہمیں خوف اور خطرہ سے بچا جا سکتا ہے۔

Marfat.com

"و" سے دِل

"د" اُردو حروفِ تہجی کا گیارھواں، فارسی کا دسواں اور عربی کا آٹھواں حرف ہے۔ حسابِ جمل میں اس کے چار عدد مقرر ہیں "د" سے دال دلیا، دین دودنیا، دکھ درد، دام ودد وغیرہ کے علاوہ یوں تو سینکڑوں الفاظ بنتے ہیں مگر اس سے بننے والے "دل" کا لفظ ایسا ہے جس کا کہ کوئی جواب نہیں۔ کیونکہ یہ ہر جاندار کا ایسا اہم اور لاینفک جزو ہے جس کی ضرورت واہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ زندگی اسی کی بدولت ہے۔ اسی کی حرکت سے حیاتِ مستعار متحرک ہے۔ حیوان ہو یا اِنسان، پرندے ہوں یا درندے، چرندے ہوں یا سواری و بار برداری کے جانور، کیڑے مکوڑے ہوں یا موروملخ، نیک ہوں یا بد، مفید ہوں یا غیر مفید، نفع بخش ہوں یا نقصان دہ کوئی بھی نکما اور بے کار نہیں۔ ان کی تخلیق میں خالق کل کی مشیّت کے ساتھ ساتھ اس کی حکمتیں اور مصلحتیں بھی پوشیدہ ہیں اس لیے مخلوق کی کسی شے کو بے مقصد اور بے کار نہیں سمجھنا چاہیئے۔

دِل بڑی عجیب اور انمول شئے ہے اور قدرت کاملہ کی شاہکار تخلیق ہے اور اس کی عمدہ ترین صناعی کا نقطۂ کمال ہے کہ اسے جسم میں اتار رکھا گیا ہے۔ بظاہر تو یہ محض خون کا ایک لوتھڑا ہے مگر حقیقت میں یہ زندگی کا محور اور حیات کا روحِ رواں ہے۔ اِنسان چونکہ اشرف المخلوقات ہے اس لئے اس کا دِل بھی دوسرے سب جانداروں سے اشرف و افضل ہے جس کے متعلق یہ کہہ کر کہ ''اگر خون کا یہ لوتھڑا ٹھیک ہے تو سب ٹھیک ہے اور اگر غلط ہے تو سب کچھ غلط ہے'' اس کی اہمیت وفضیلت کو یوں اجاگر کیا گیا ہے کہ

''دِل خدا کا گھر ہے'' اس میں خدا بستا ہے۔ یہ ایک آئینہ ہے جس میں جھانکنے سے خدا نظر آتا ہے۔ اس کی شکست وریخت اور ٹوٹ پھوٹ اس کی بدنمائی کا باعث ہے اور ایسے میں اس سے تصویر دھندلی منعکس ہوتی ہے مگر خدا معلوم کہ اقبالؒ کے دِل میں کیا تھا جو اس نے اس کی شکستگی کو اہمیت دیتے ہوئے یہ کیوں کہا ہے کہ

تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے ترا آئینہ ہے وہ آئینہ
کہ شکستہ تر ہو تو عزیز تر ہے نگاہ آئینہ ساز میں

Marfat.com

اور بقول شاعرے:

دل کے آئینے میں ہے تصویرِ یار
جب کبھی چاہا گردن جھکائی دیکھ لی

دل وہ دل نہیں جس میں تیری یاد نہیں
ہے وہ کافر جو تیری راہ میں برباد نہیں

دِل کی کئی اِقسام ہیں اور کئی خواص ہیں۔جیسے: دلِ حزین وغمگین، دلِ افسردہ و پژمردہ، دلِ عاشق، دلِ معشوق، دلِ گرفتہ، دلِ شکستہ، دلِ زدہ، دلِ مردہ، دلِ زندہ، دلِ شگفتہ، دلِ آسودہ وغیرہ وغیرہ۔مزید برآں

اہلِ زبان نے دِل کے سابقے اور لاحقے سے بڑے بڑے دلفریب الفاظ ومحاورات اور تراکیب ومرکبات وضع کر کے اپنی زباندانی کا لوہا منوایا ہے مگر عشاق نے اسے ایک کھلونا سمجھ کر عجیب وغریب کھیل کھیل کر اسکی قدر ومنزلت کو پامال کر دیا ہے۔ادباء وشعراء نے اس سے بڑے بڑے کام لئے اور نکالے ہیں اور اس پر طبع آزمائی کرتے ہوئے اس کی نسبت سے طرح طرح کے مضامین پیدا کر کے اپنی جدت طرازی کا ثبوت دیا ہے۔آیئے اب ہم زباندانوں، عاشقوں، ادیبوں اور شاعروں کی دل سے متعلق خیال آرائیوں اور مضمون آفرینیوں کا حسبِ توفیق مختصر سا احاطہ کرنے کی سعی کرتے ہیں:

کہتے ہیں کہ دل اپنی مرضی کا مالک ہے۔اس کی اپنی ایک دنیا ہے جو کبھی بس جاتی ہے اور کبھی اجڑ جاتی ہے، کبھی بس کر اجڑ جاتی ہے اور کبھی اجڑ کر بس جاتی ہے جو اس کے قرار اور بے قراری، چین اور بے چینی، راحت اور رنج اور آبادی وبربادی کا باعث بنتی ہے۔

یہ بھی کہتے ہیں کہ جب دل سے دل مل جاتا ہے تو محبت ہو جاتی ہے اور جب محبت ہو جاتی ہے تو دل مل جاتا ہے مگر میں کیا جانوں؟ یہ دل کا معاملہ ہے دل والوں کو ہی معلوم ہوگا۔ایک دل گرفتہ جب اپنے دلدار ودلبر کا دیدار کرتا ہے تو اس کا دل باغ باغ ہو جاتا ہے یعنی اس کے دل کے باغ کی تمام کلیاں کھل اٹھتی ہیں۔

دلدار کی دلبرانہ ادائیں بڑی دل آویز، دلکش اور تادیر دلنشین رہنے والی ہوتی ہیں مگر اس کی چیرہ دستیوں، ستمرانیوں، جفاجوئیوں، دل سوزیوں اور دل آزاریوں کے لامتناہی سلسلہ سے

Marfat.com

مریضِ عشق اپنے تئیں بے بس اور لاعلاج سمجھ کر پکار اٹھتا ہے کہ

از سرِ بالینِ من برخیز اے ناداں طبیب دردمندِ عشق را دارو بجز دیدار نیست

اور جب ستم شعار، جفا پیشہ بتِ بیدار گر کی عدم توجہی، بے وفائی اور وعدہ شکنی کا تسلسل اپنی انتہا کو پہنچ جاتا ہے تو دلِ عاشق کی بے دلی، بے زاری، مایوسی اور ناامیدی میں بے پناہ اضافہ ہو جاتا ہے تو اس کی حالت زار دیکھ کر دلِ معشوق تھوڑا سا پسیجتا ہے اور اس کے گوشۂ دل میں تھوڑی سی نرمی آتی ہے تو وہ اپنے عاشق کی دلدادی کی خاطر پھر جھوٹے وعدے سے طفل تسلیاں دیتے ہوئے بزبانِ شاعر کہتا ہے کہ

وعدہ نہ وفا کرنا اور اس پہ یہ تاکیدیں
تا حشر ٹھہر جاؤ کیوں جان نکلتی ہے

دل کی دو خاص خوبیاں ہیں چاہت اور خلوص _____ ان سے اگر دل خالی ہو تو دل دل ہی نہیں رہتا لوگ ایسے دل کو دل ہی دل میں کوستے رہتے ہیں۔ مہر و محبت، شفقت و رافت، ہمدردی و غمگساری اور رحم و کرم کی صفات سے عاری دل اپنی پسندیدگی کھو دیتا ہے۔ صبر و تحمل، برداشت، بردباری، وفا کیشی، دوراندیشی اور مصلحت بینی کے جوہر اگر اس میں نہیں تو وہ بھی دل کہلانے کا مستحق نہیں سمجھا جاتا۔

یہ حقیقت ہے کہ دل آرزوؤں، تمناؤں اور خواہشوں کا مرکز ہے اور خواہشیں کبھی ختم نہیں ہوتیں یہ زندگی کے ساتھ ساتھ بڑھتی اور چلتی رہتی ہیں۔ یہ اِنسانی زندگی کی گاڑی کو رواں دواں رکھتی ہیں اور اِنسان اپنے ارمانوں کے حصول کے لئے مصروفِ عمل رہتا ہے اور اپنی بساط سے بڑھ کر تگ و دو اور کوشش و کاوش سے انہیں پایۂ تکمیل تک پہنچا کر سکون و اطمینان، آرام و راحت اور آسودگی محسوس کرتا ہے مگر اِنسانی فطرت کی یہ کمزوری ہے کہ اگر ایک خواہش پوری ہوتی ہے تو دوسری جنم لے لیتی ہے اور اگر ایک ارمان دل سے نکل آتا ہے تو دوسرا دل میں گھر کر لیتا ہے غرض آرزوؤں اور تمناؤں کا لامتناہی سلسلہ اِنسان کو آسودگیاں بہم پہنچانے کے بجائے اسے بے سکونی اور بے اطمینانی کے اندھے غار میں پہنچا دیتا ہے اور ارمانوں کی تلاطم خیزیاں اسے سمندر کی اتھاہ گہرائیوں میں ایسے گم کر دیتی ہیں کہ وہ ابھر نہیں پاتا۔ غالبؔ نے کیا خوب کہا ہے:

Marfat.com

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی وہ کم نکلے

کہتے ہیں کہ جب عاشق کا دل کسی پر آجاتا ہے تو وہ بے قابو ہو جاتا ہے اور عاشق حزیں و دردِ دل کا شکار ہو کر رہ جاتا ہے اور چونکہ اس درد کا علاج بجز دیدارِ یار ممکن نہیں اس لئے وہ اپنا دل اپنے محبوب کی نذر کر دیتا ہے اور اس سے قبولیت کا مستدعی ہوتا ہے مگر محبوب اپنی بے نیازیوں اور ستم رانیوں سے اسے ٹھکرا دیتا ہے اور نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ یہ بیماری اس کا کام تمام کر دیتی ہے۔

دل کی فتنہ سامانیوں اور اس کی بے قدری کا حال خدائے سخن میر تقی میر کی زبانی ملاحظہ ہو۔ فرماتے ہیں:

دل ایک قطرۂ خون نہیں ہے بیش ایک عالم کے سر بلا لایا
قدر رکھتی نہ تھی متاع دل سارے عالم میں میں دکھا لایا

جہاں عاشق لوگ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر نوحہ کناں ہوتے ہیں وہاں شاعر حضرات بھی دل کھول کر دل کا رونا روتے ہیں۔ نوحے پڑھتے ہیں اور مرثیے لکھتے ہیں۔ بزبانِ غالب:

دل ہی تو ہے نہ کہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں اٹھائے کیوں

مگر

دونوں (شعراء) کی آہ و بکا کی کبھی شنوائی نہیں ہوئی اور ہو بھی کیونکر۔ کیونکہ نوعِ انسانی کے یہ دونوں طبقے (اہلِ دل اور شاعر) عشق زدہ ہوتے ہیں اور ان کے ظالم و ستم گر معشوق کے سینے میں ایسا پتھر کا دل ہوتا ہے جو کبھی موم نہیں ہوتا اور اپنے عاشق کی حالتِ زار پر کبھی نہیں پسیجتا جبکہ دیکھنے والوں کے دل تڑپ اٹھتے ہیں۔

المختصر دل انمول چیز ہے۔ دل سے اس کی قدر کیجئے اس کی حفاظت کیجئے اور سنبھال کر رکھیئے۔ اسے آئینہ کی طرح صاف و شفاف رکھیئے۔ نہ کسی کا دل لیجئے اور نہ کسی کو اپنا دل دیجئے نہ کسی پر پھینکئے۔ اگر ہو سکے تو ہر ممکن طریق سے دوسروں کے دل موہ لینے کی کوشش کیجئے۔ اسے دنیا کے پیچھے ہرگز نہ لگایئے اور مسائل و مشکلات میں بڑا رکھیئے۔ اور ہاں بڑوں کا یہ کہنا بھی یاد رکھیئے کہ پیار، بھروسا اور وفا دل کو آباد رکھتے ہیں۔

Marfat.com

"و" سے دو

دوحرف عدد ہے۔ایک اورایک کا مجموعہ یاایک کا دگنا اور چار کا نصف۔ کہتے ہیں کہ ایک اکیلا ہوتا ہےاور دو گیارہ۔اور یہ بھی کہتے ہیں کہ دواور دو چار ہوتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ جب دو ایک مل کر گیارہ(11) ہوتے ہیں تو دواور دو کو ملا کر بائیس(22) کیوں نہیں کہا جاتا؟اور جس طرح دواور دو چار ہوتے ہیں اسی طرح ایک اورایک مل کر دو(2) کیوں نہیں کہا جاتا؟

اگر انہیں ساتھ ہی ملانا ہے اور جمع ہی کرنا ہے تو ان کی جمع کے ساتھ ساتھ ان کی تفریق اور تقسیم کیوں نہیں کی جاتی؟ دوایک پر تقسیم بھی ہوسکتا ہے جس کا حاصل تقسیم بھی دو ہی نکلتا ہے مگر ایک ہے کہ وہ نہ تو دو پر تقسیم ہوسکتا ہے اور نہ اس میں سے دد کو تفریق ہی کیا جاسکتا ہے۔بس وہ ایک ہی ہے اور ایک ہی رہتا ہے_____ واحد اور تنہا_____ اسی سے اس کی عظمت واضح ہوتی ہے کہ خدا تعالیٰ ایک، واحد اور تنہا ہے۔دو کی طرح اس میں نہ دوئی ہے اور نہ مشرک۔

اب اگر ہم ایک اور دو کو ایک ایک کر کے یا دو دو کر کے دیکھیں تو ایک کو اگر ایک ایک کیا جائے تو تنہائی، جدائی، نفرت، منافرت، حسد، مخالفت اور تباہی کے مفاہیم متبادر ہوتے ہیں اور اگر دو کو دو دو کیا جائے تو اس کے ٹکڑے بن کر بھی اشتراک ورفاقت کا رشتہ منقطع نہیں ہونے پاتا۔البتہ ایک ایک کر کے کاموں اور دشمنوں کو بآسانی ختم کیا جاسکتا ہے اور مسائل حل کئے جاسکتے ہیں مگر کسی قبیلے، کنبے یا جماعت کو ایک ایک کر کے ان میں پھوٹ ڈالی جاتی ہے۔اسی طرح ایک محاذ پر جنگ تو لڑی جاسکتی ہے مگر دو محاذوں پر بیک وقت جنگ آزما ہونا مشکلات سے دوچار ہو کر شکست کو دعوت دینا ہے۔

دو کے معنی جفت، جوڑا، چنداور جُدا کے بھی ہیں۔اہلِ زبان نے دو کے سابقے سے بے شمار الفاظ وتراکیب بھی وضع کر رکھی ہیں جیسے: دوآب/ دوآبہ۔ دوایک۔ دودو۔ دوچار۔ دوبیتی۔ دوغزلہ۔ دوپٹہ۔ دوپرتا۔ دوتا۔ دوپہر۔ دوتہی۔ دوٹوک۔ دوجہاں/عالم۔ دوعملہ۔ دوچلّو۔ دوحرف۔ دوحرفی۔ دودلہ۔ دودن/ روز۔ دودھارا۔ دوراہا۔ دورنگا۔ دوشاخہ۔ دوسالہ۔ دوشالہ۔

Marfat.com

دوقدم۔دوکوڑی۔دوگانہ۔دوگھڑی/پل۔دولخت۔دومنزلہ۔دومنہا۔دوفصلہ۔دونیم وغیرہ۔

دو کی نسبت سے بہت سی کہاوتیں بھی سننے اور پڑھنے میں آتی ہیں جیسے: دوآدمیوں کی گواہی سے پھانسی ہوجاتی ہے۔دو پیالے پی تو لیں حرامزدگی پیٹ میں ہے(یعنی دل میں کھوٹ رکھ کر فائدہ اٹھانا) دو جورو کا خصم چوسر کا پانسا(یعنی دو بیویوں والا ہمیشہ تکلیف میں رہتا ہے) دو خصم کی جورو چوسر کی گوٹ(یعنی دو آدمیوں سے تعلق رکھنے والی عورت ماری جاتی ہے) دو چُون کے بھی بُرے ہوتے ہیں(یعنی دو کمزور اتفاق کر کے زبردست بن جاتے ہیں) دو دن کی بہار اور دس دن کی پت جھڑ(یعنی عیش کم اور تکلیف زیادہ) دو سے تین بھلے(یعنی جتنے زیادہ آدمی اتنا زیادہ کام) دو لڑتے ہیں تو ایک گرتا ہے(یعنی لڑائی میں ایک کو ضرور شکست ہوتی ہے) دو ملاؤں میں مرغی حرام(یعنی جب دو دعویدار ہوں تو کام بگڑ جاتا ہے) دو میں تیسرا آنکھ میں ٹھیکرا(یعنی دو کی صحبت ہی بھلی ہوتی ہے) دو میانوں میں ایک چھری(یعنی دو عورتوں میں ایک آدمی)۔

اب دو کے چند کارنامے ملاحظہ ہوں:

مفلس محتاج شخص دو دو دانے کو در در پھرتا ہے مگر اسے دو دن کی زندگی میں شاید ہی کبھی دو دو منہ ہنسنے کا موقع ملا ہو(تھوڑا سا) سیاستدان دو رنگی میں رنگے ہوتے ہیں۔وہ ہمیشہ دو فصلی باتیں کرتے ہیں اور دو عملی سے کام لیتے ہیں لیکن جب ان کے حواریوں کو ان سے دو کوڑیاں تک بھی نہیں ملتیں تو ان کی اصلیت ظاہر ہوجاتی ہے اور لوگ انہیں دو کوڑی کو نہیں پوچھتے (خاطر میں نہیں لاتے)۔دو وکیل جب عدالت میں دو بدو ہوتے ہیں تو وہ دو گھڑی کی واہ واہ سے بڑے خوش ہوتے ہیں لیکن جب عدالت فیصلہ سناتی ہے تو ناکام وکیل پر اس کے مؤکل دو حرف بھیجتے ہیں (ملامت کرتے ہیں) مے خوار دو آتشہ شراب سے مدہوش ہوجاتا ہے مگر ایک طالب علم کو جب اس کا استاد دو لگاتا ہے تو اس کے ہوش اڑ جاتے ہیں مگر پولیس جب ملزم کو دو لگاتی ہے تو وہ سچ اگل دیتا ہے۔کہتے ہیں کہ عورت دو دھاری تلوار ہوتی ہے اور مرد دو دھارا خنجر مگر جب کبھی میاں بیوی میں دو دو نوکیں ہوجاتی ہیں تو وہ دو دو ہاتھ ہوجاتے ہیں (تھوڑی سی لڑائی) لیکن دو دن بعد ہی وہ دوبارہ ایک ہوجاتے ہیں کیونکہ ان کی نوک جھوک بالکل وقتی اور عارضی ہوتی ہے۔

ایک، دو اور دو دو کے اس تذکرے کے بعد بس ہمارے لئے اتنا جان لینا کافی ہے کہ ایک ایک ہی ہوتا ہے اور دو دو ہی ہوتے ہیں۔دونوں کے الگ الگ خواص و برکات ہیں۔ایک ایک

Marfat.com

ہونا اور دو دو کرنا دوئی، انتشار اور ناکامی سے دوچار ہونا ہے مگر ایک کا ہو رہنا (جیسا کہ مرید کا پیر سے، بیوی کا خاوند سے اور بندہ کا خدا سے) دو کشتیوں میں پاؤں رکھنے سے بہتر ہے۔ ایک میں یکتائی، یکجہتی، یک رنگی اور یک رخی ہے اور دو میں دوتائی، دوئی، دورنگی اور دورخی ہے اور آپ جانتے ہیں کہ یک رنگی دورنگی سے بہرنوع بہتر ہے جیسا کہ شاعر نے بھی کہا ہے کہ

دورنگی چھوڑ کر یک رنگ ہو جا سراسر موم یا سنگ ہو جا

مرد کی بات ایک اور دو ٹوک ہوتی ہے جو ظاہر اور باطن کے ایک ہونے کی دلیل ہے مگر دوغلی اور دو فصلی بات دل و زبان کی دوئی کی مظہر ہے اور سراسر منافقت ہے اور منافق کافر سے بدتر ہوتا ہے۔ ایک جہان کے ہو کر رہ جانا اور دوسرے جہان کو خاطر میں نہ لانا خلافِ عقل ہے۔ یہ بھی سچ ہے کہ ایک ہاتھ سے تالی نہیں بجتی مگر دو دو ہاتھ اچھلنا (بے تاب و مضطرب ہونا) اور آپس میں دو دو ہاتھ ہونا (لڑنا) کہاں کی عقلمندی ہے؟ البتہ دو باتیں سن کر ایک بات کہنا دانشمندی ہے۔ بزبانِ شاعر:

کہے ایک جب سن لے اِنسان دو
زبان حق نے دی ایک اور کان دو

Marfat.com

دعا اور دوا

دعا اور دوا دونوں عربی کے مونث الفاظ ہیں۔دعا کے معنی التجا اور مانگنا کے ہیں اور دوا دارو اور علاج معالجہ کے معنی دیتا ہے۔دوا کسی طبیب، حکیم یا ڈاکٹر سے لی جاتی ہے اور دعا صرف اللہ تعالیٰ سے کی جاتی ہے۔دعا اور دوا میں صرف اسی قدر اشتراک ہے کہ

۱) دعا بھی دی جاتی ہے (بھلائی مانگنا) اور دوا بھی دی جاتی ہے (علاج کرنا)۔

۲) دعا بھی لگتی ہے (منظور ہوتی ہے) اور دوا بھی لگتی ہے (اثر کرتی ہے)۔

زندگی صرف ناؤ نوش ہی کے لئے نہیں بلکہ حقیقتاً یہ بندگی سے عبارت ہے اور بندگی سراپا دعا ہی دعا ہے۔زندگی کی بقا کے لئے غذا اور صحت و تن درستی لازم ہیں۔زندگی کو اگر دو پہلوؤں سے دیکھا جائے (یعنی روحانی اور جسمانی لحاظ سے) تو ذہن و قلب اور روح کی تسکین کے لئے دعاؤں کی ضرورت ہے اور جسمانی صحت و تندرستی کے لئے غذا ضروری ہے اور اِنسانی امراض / عوارض کے دفعیہ کی خاطر شفا بخش دواؤں کی ضرورت ہے۔قدرتِ خداوندی کا یہ کمال ہے کہ اس نے نباتات اور معدنیات میں غذائیہ اور شفائیہ ایسے اجزا رکھے ہیں جنہیں اہلِ حکمت و دانش نے جانچ پرکھ کر مختلف طریقہ ہائے علاج وضع کئے ہیں اس لئے روح اور جسم کی صحت و صفائی اور بقا کے لئے اور ان ہر دوا کے امراض کے دفعیہ کے لئے ہمیں دو طرح کے معالجوں کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے _____ یعنی روحانی معالج اور جسمانی معالج _____ روحانی معالجوں میں صوفیا، اولیاء اور پیر و مرشد شامل ہیں اور جسمانی معالجوں میں طبیبوں، حکیموں اور ڈاکٹروں کا شمار ہوتا ہے لیکن ہمیں اپنے جسم و جان کو جوگیوں، سنیاسیوں، جعلی پیروں، نیم حکیموں، نقلی طبیبوں اور مصنوعی ڈاکٹروں کے رحم و کرم کی نذر نہیں کرنا چاہیئے اور نہ عشاق شعراء کے خیالی اور تصوراتی فرمودات پر ہی عمل پیرا ہونا چاہیئے جو یہ فرماتے ہیں کہ

i) از سرِ بالینِ من برخیز اے ناداں طبیب
کہ دردمندِ عشق را دارو بجز دیدار نیست

ii) جان تم پر نثار کرتا ہوں میں نہیں جانتا دعا کیا ہے

لیکن فارسی کا یہ شعر ضرور قابلِ غور و عمل ہے کہ

Marfat.com

بترس از آہ مظلوماں کہ ہنگامہ دعا کردن
اجابت از درِ حق بہر استقبال می آید

دوا جسمانی بیماریوں کا علاج ہے اور دعا قلب وذہن کے عوارض کی مؤثر دوا ہے۔ جس طرح اعتمادی حکیم کی دوا زود اثر ثابت ہوتی ہے کیونکہ مریض اسے یقین کے ساتھ استعمال کرتا ہے عین اسی طرح اگر خلوص ایمان اور یقین واعتماد خشوع وخضوع اور نہایت عاجزی وانکساری سے دعا کا عمل جاری رکھا جائے تو فیضیابی یقینی اور قریب تر ہوتی ہے۔ حکیم کی دوا کے ساتھ ساتھ دعا سونے پر سہاگے کا کام کرتی ہے۔ اکثر یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ دعا مریض کو حکیم کی دوا سے بے نیاز بھی کر دیتی ہے۔

مختصر یہ کہ دعا طلب ہے اور دوا علاج ہے۔ دعا خدا تعالیٰ سے کی جاتی ہے اور دوا حکیم سے لی جاتی ہے۔ دعا آفات ومشکلات کا علاج ہے اور دوا امراض کا مداوا ہے۔ دعا سے خواہشات و آسائشات کی مانگ کی جاتی ہے اور دوا سے صحتیابی کی تمنا کی جاتی ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ دعا اور دوا زندگی اور صحت کے لئے ضروری ہیں۔ ان سے کسی نوع مفر نہیں لہٰذا ہر دو کا استعمال کرتے رہنا چاہیئے اسی میں عافیت ہے کیونکہ دعا اور دوا سنّتِ نبویؐ ہیں۔

بے شک دوا میں شفا ہے مگر دعا کی اثر پزیری بھی مسلّم ہے اور اس سے انکار عبدیت کے تقاضوں سے فرار کے مترادف ہے۔ یہاں یہ بات ذہن نشین رکھنا نہایت ضروری ہے کہ ہر خواہش کی تکمیل، ہر تمنا کا حصول، ہر آفت اور ہر مصیبت سے نجات اور ہر مشکل کے حل کے لئے ہمارے پاس قرآنی اور مسنون دعائیں موجود ہیں جن کی مداومت ہماری دنیاوی اور اخروی فوز وفلاح کی ضامن ہیں لیکن ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم ان کو اپنا شعار اور معمول بنا کر انعام واکرام ربانی سے مستفیض ہونے کی سعی کریں اور ان حقائق کی صداقت کا دم بھریں کہ

۱) دعا بہترین عبادت ہے۔
۲) دعا مصیبت کو ٹال دیتی ہے۔
۳) تقدیر بدل جاتی ہے دعاؤں کے اثر سے

آخر میں دعا گو ہوں کہ رب العزت اپنی پیاری مخلوق کی دعاؤں کو قبول ومنظور فرمائے اور ادویات کے استعمال میں شفائے کاملہ وعاجلہ سے نوازے اور مجھ احقر کو بھی علم وعمل کی توفیق بخشے۔

"ایں دعا از من واز جملہ جہاں آمین باد"

Marfat.com

دکھ اور درد

دکھ مصیبت اور رنج کو کہتے ہیں۔ آفت اور تنگی کا مفہوم بھی دیتا ہے اور درد ٹیس، ہوک اور تکلیف کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے علاوہ ازیں یہ رنج وغم اور سوز وگداز کے بھی معنی دیتا ہے۔ اسے ہمدردی کا نام بھی دیا جاسکتا ہے۔

دکھ اور درد ایک دوسرے کے ہم معنی اور مترادف بھی ہیں۔ یہ الگ الگ بھی استعمال ہوتے ہیں اور ایک ساتھ بھی۔ ان کے اکٹھا استعمال ہونے سے اس سے مراد آفت/ مصیبت یا آفتیں/ مصیبتیں لی جاتی ہیں۔ دکھ کا متضاد سکھ اور درد کا متضاد آرام ہے۔ سکھ کے ساتھ چین اور آرام کے ساتھ سکون جب ایک ساتھ استعمال ہوتے ہیں تو ان کے مفاہیم میں اتنی ہی گہرائی اور گیرائی پیدا ہو جاتی ہے جتنی کہ دکھ درد کے باہم استعمال سے پیدا ہوتی ہے۔

دکھ اور درد سوچ اور احساس کا نام ہے جو دل میں پیدا ہوتا ہے اور دماغ میں سمایا جاتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ احساس اندرونی اور باطنی ہے بیرانی اور خارجی نہیں ہے۔ یہ نظر نہیں آتا۔ یہ کینسر کے مانند ہوتا ہے جو اندر ہی اندر انسان کو کھاتا رہتا ہے۔

دکھ ہندی الاصل ہے اور درد کی اصل فارسی ہے مگر ہیں دونوں مذکر۔ دکھ سے دکھی اور دکھیارا اسمائے صفت ہیں جبکہ درد سے دردمند اور دردی اسمائے صفت ہیں۔

دکھ کی بے شمار اور لاتعداد صورتیں اور قسمیں ہیں۔ اتنی زیادہ اور بے حد ہیں کہ ان کی بنیاد پر دنیا کو ''دکھوں کا گھر'' اور ''دکھ ساگر'' کہا جاتا ہے۔

انسان کو دنیاوی زندگی میں ہر لمحہ، ہر آن اور ہر قدم پر کسی نہ کسی دکھ سے واسطہ پڑتا ہے مگر پیٹ کا دکھ اور اولاد کا دکھ سب سے زیادہ تکلیف دہ ہوتے ہیں۔

دکھ کی طرح درد کی صورتیں اور قسمیں بھی ان گنت ہیں۔ اگر انہیں ہم مجتمع کریں تو اس کی دو نمایاں قسمیں سامنے آتی ہیں _____ دردِ خویش اور دردِ دیگراں _____ جن کا مداوا ایک دوسرے کی شرکت وشراکت سے بہت حد تک ممکن ہوسکتا ہے مگر دردِ دل اور دردِ عشق ناگہانی بلاؤں سے کم نہیں جن کا مقابلہ لاکھ جتن کرنے سے بھی ممکن نہیں البتہ طبی لحاظ سے درد کی جو مختلف اقسام ہیں (مثلاً دردِ معدہ وجگر۔ دردِ گردہ ومثانہ۔ دردِ سر۔ دردِ دندان۔ دردِ شکم۔ دردِ قولنج۔ دردِ شقیقہ وغیرہ وغیرہ) تکلیف دہ ہونے کے باوجود قابلِ علاج ہیں۔ یوں تو ہر بیماری اور ہر عارضہ درد افزا

Marfat.com

اور پریشان کن ہے مگر دردِزہ کو سب سے زیادہ شدید اور ناقابلِ برداشت سمجھا جاتا ہے مگر عورت موت وحیات کی کشمکش کے باوجود بڑے دل گردے سے اس سے عہدہ برآ ہوتی ہے عجب بات یہ ہے کہ دردِزہ سے نجات پا کر اس سے ہر چند توبہ کرتی ہے مگر وہ اس توبہ پر کاربند نہیں رہ پاتی۔

دکھ اور درد یا دکھ درد بے شمار اسماء وافعال سے مل کر گوناگوں مطالب ومفاہیم کے عکاس و ترجمان کا روپ دھار لیتے ہیں مگر اس دکھوں بھری دنیا میں ایک درد بھرا دل دکھ پر دکھ ہی اٹھاتا ہے اور دکھ درد ہی سہتا رہتا ہے تاہم ایک دوسرے کا دکھ درد جاننا، پوچھنا اور بٹانا انسانیت کے اہم فرائض سمجھے جاتے ہیں۔ کسی دکھ کے مارے کا ساجھی بننا یا درد کے مارے کا دردمند بن کر اس کے دکھ اور درد کو دور کرنے کی کوشش کرنا بہت بڑا نیکی کا کام ہے مگر کسی کو درد آلود کرنا اور دکھ دینا شیطانی افعال متصور کئے جاتے ہیں ہر چند ایسے افعال سے اجتناب کرنا چاہئیے۔ خدانخواستہ اگر آپ کو کسی سے کوئی دکھ ملے/ پہنچے تو آپ اسے نظر انداز کر کے معاملہ خدا کے سپرد کر دیجئے اور احتیاط کیجئے کہ آپ نہ کسی کی دکھتی رگ کو چھیڑیں اور نہ کسی کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھیں کیونکہ یہ معیوب حرکت دوسروں کے لئے دردافزا اور دکھ دہ ثابت ہوتی ہے۔

نیک دل انسان دوسروں کو نہ دکھ میں دیکھ سکتے ہیں اور نہ انہیں دکھی کرنے کا کبھی سوچ ہی سکتے ہیں اور دردمند لوگ دوسروں کے درد میں برابر کے شریک رہتے ہیں۔ والدین اپنی اولاد کا دکھ درد کبھی نہیں دیکھ سکتے وہ ان کے دکھ درد اپنے سر لے لیتے ہیں بلکہ ان کہ جگہ سر بھی دے دیا کرتے ہیں۔

دکھ (درد) کا کوئی رنگ، کوئی مذہب اور کوئی نام نہیں۔ دکھ (درد) تو دکھ (درد) ہے جو دل سے نکل کر آنکھوں کے راستے امڈ پڑتا ہے کیونکہ آنسو دکھوں کا ذریعہ اظہار ہیں۔ دکھ/ درد احساسات، جذبات اور خواہشات کی موت سے جنم لیتے ہیں اور دل میں گھر کر لیتے ہیں اور روح کو تڑپا دیتے ہیں اور جب اس تڑپ میں کسک اور شدت بڑھتی ہے تو اس کا اظہار آنسوؤں اور آہوں کی صورت میں عیاں ہوتا ہے۔ مگر

یہ یاد رہے کہ غیروں کے دیئے ہوئے دکھ/ درد تو انسان جھیل لیتا ہے مگر وہ دکھ/ درد جو اسے اپنے دیتے ہیں وہ نہ جھیلے جاسکتے ہیں اور نہ بھلائے جاسکتے ہیں۔

دکھ اور درد کے اس تذکرے کے بعد مختصراً میرا کہنا تو بس یہی ہے کہ

کسی کو دکھ دے کر دکھی نہ کرو اور
کبھی بے درد نہ بنو بلکہ ہمدرد بنو

Marfat.com

دکھ اور سکھ

دکھ درد، تکلیف، آفت اور رنج وغم سے عبارت ہے اور سکھ آرام، سکون، راحت، خوشی اور مسرت کا دوسرا نام ہے۔

دکھ اور سکھ ہم صوت، ہم وزن اور توام ہیں اس لئے انہیں ایک دوسرے کے دوست اور حلیف سمجھا جاتا ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ یہ ایک دوسرے کے خلاف (متضاد) بھی ہیں۔ اس ناطے سے انہیں ایک دوسرے کے دشمن اور حریف بھی قرار دیا جاتا ہے۔

دکھ آگ اور تپش ہے۔ سکھ آب اور ٹھنڈک ہے۔ دکھ اٹھائے جاتے ہیں، بھرے جاتے ہیں، بھگتے جاتے ہیں، پائے جاتے ہیں، سہے جاتے ہیں اور جھیلے جاتے ہیں جبکہ سکھ پائے جاتے ہیں، دیکھے جاتے ہیں اور مانے (Enjoy) جاتے ہیں۔ دکھ باعث زحمت ہوتے ہیں اور سکھ موجب راحت ہوتے ہیں۔ دکھوں کا مارا دکھی، دکھیا اور دکھیارا کہلاتا ہے اور سکھوں کے پانے والے کو سکھی یا سکھیا کہتے ہیں۔ دکھ پہچانے والے کو ''دکھ دانی'' اور سکھ پہچاننے والے کو ''سکھ دانی'' کہتے ہیں۔

دکھ کا تعلق احساس اور جذبہ سے ہے۔ یہ خفیہ اور اندرونی ہوتا ہے جبکہ سکھ کا تعلق اظہار اور دید سے ہے۔ یہ خارجی اور بیرونی ہوتا ہے۔ انسان کو حیات مستعار میں نت نئے دکھوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے جبکہ سکھ نصیبوں سے ملتے ہیں۔ دکھ کے لمحات بڑے طویل اور تکلیف دہ ہوتے ہیں جبکہ سکھ کی گھڑیاں مختصر اور زود گزشتنی ہوتی ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ دکھ عمومیت کے رنگ میں ڈوبا ہوتا ہے اور سکھ پر خصوصیت کا رنگ چڑھا ہوتا ہے۔

اگرچہ دکھ اور سکھ ایک دوسرے کے نقیض ہیں لیکن راہ حیات میں ایک ساتھ ہم سفر ہوتے ہیں۔ یہ زندگی کا خاصا اور لازمہ ہیں۔ ان سے انکار اور مفر ممکن نہیں کیونکہ ان دونوں کی حقیقت و ماہیت مسلّم ہے اور ان کی اہمیت بڑی واضح ہے۔ یہ ایک ساتھ استعمال بھی ہوتے ہیں اور ایک ساتھ چلتے بھی ہیں۔ دکھ سکھ کی یہ باہمی رفاقت مبنی بر حقیقت ہونے کے باوجود بڑی حیران

Marfat.com

کن بھی ہے کیونکہ دکھ کے وقت سکھ ناپید ہوتا ہے اور سکھ کے وقت دکھ نابود ہوتا ہے۔ میرے خیال میں ان کی بود و نابود کا یہی فلسفہ ان کی بقا کا ضامن ہے اور اسی میں ان کی مداومت کا راز مضمر ہے۔ دکھ سکھ کے اس باہمی ملاپ سے بنی یہ ضرب الامثال اس حقیقت کی عکاس دکھائی دیتی ہیں:

ا: دکھ سکھ بھائی بہن ہیں۔

۲: دکھ سکھ کے ساتھ لگا ہے۔

۳: دکھ میں سکھ کی قدر ہوتی ہے۔

۴: سکھ سپنت کا سب کوئی ساتھی۔

۵: سکھ میں رب کو یاد کرے تو دکھ کاہے کا۔

عام طور پر دکھ کے ساتھ درد اور سکھ کے ساتھ چین کا استعمال ہوتا ہے _____ یعنی دکھ درد اور سکھ چین _____ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا شمار مترادفات میں ہوتا ہے مگر میں سمجھتا ہوں کہ ان کے ایک ساتھ استعمال کی بدولت دکھ اور سکھ میں شدت و بہتات پیدا ہوتی ہے اور ان کی گہرائی اور گیرائی میں اضافہ ہوتا ہے۔ مزید برآں یہ کہ صوتی اور معنوی لحاظ سے ان کا باہم استعمال خالی از لطف بھی نہیں۔

دکھ اور سکھ کے ذکر اذکار سے میں نے جو نتائج اخذ کئے ہیں ان کی مختصر سی تفصیل کچھ یوں ہے:

1: دکھ اور سکھ دو الگ الگ کیفیتیں ہیں۔

2: دونوں یکجا اور ہمنشیں نہیں ہو سکتے۔

3: دونوں کو استحکام حاصل نہیں۔

4: دونوں عارضی، وقتی اور گزشتنی ہیں۔

5: ان نتائج کی روشنی میں میرے خیال میں ہمیں تلقین کا یہی درس ملتا ہے کہ

i: دکھ میں گھبرانا اور سکھ میں اترانا نہیں چاہیئے۔

ii: ہمیں چاہیئے کہ ہم ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک ہوں تا کہ دکھ بانٹے جا سکیں

• اور سکھ بتائے/منائے جا سکیں۔

Marfat.com

iii: ہمیں یہ دعا کرنی چاہیئے اور دعا کروانی چاہیئے کیونکہ دعا سے دکھ دور ہو جاتے ہیں اور سکھ کی امید بندھتی ہے۔

کہا جاتا ہے اور صحیح کہا جاتا ہے کہ ''دنیا دکھوں کا گھر ہے'' یہ سکھوں کی سیج نہیں۔ لہٰذا یہ جانتے ہوئے کہ ''دکھیارا سب سنسار'' میری تو بس یہی دعا ہے کہ رب العزت ہم سب کو دکھوں سے نجات دلائے اور سکھ کی سانسیں عطا فرمائے۔ دکھ دور ہوں اور سکھ نصیب ہوں تا کہ ہم سکھ کی نیند سو سکیں۔ آمین۔

Marfat.com

دل اور دماغ

دل فارسی زبان کا لفظ ہے اور دماغ عربی کا۔دونوں عضوِ بدن ہیں۔دل حوصلہ، جرأت، خواہش، خوشی، سخاوت اور وسط کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔دماغ مغز گودا اور بھیجا کے معنوں کے علاوہ عقل وفہم، تاب و طاقت، ہوش وحواس، برداشت اور غرور کے معنوں میں بھی مستعمل ہے۔

دل اور دماغ دونوں بڑے اہم عضو ہیں۔دماغ جسم کو کنٹرول کرتا ہے دل جسم کو خون پہنچاتا ہے اور ہر وقت حرکت میں رہتا ہے اور اس کے بند ہونے سے فوراً موت واقع ہو جاتی ہے دل سینے میں الٹا لٹکتا ہے اس کی شکل پان کی سی ہے اور اس کی ماہیت گوشت کے ایک لوتھڑے کی سی ہے۔دماغ کھوپڑی میں چھپا ہوتا ہے اور اس کی ماہیت گوندھے ہوئے نرم گودے کی سی ہے۔

دل دھڑکتا، مچلتا اور تڑپتا ہے اور دماغ غور وفکر کرتا ہے اور سوچتا سمجھتا رہتا ہے۔دل محسوس کرتا ہے، خیال کرتا ہے اور دماغ اس کے احساسوں اور خیالوں کو اپنی سوچ اور فکر سے عملی صورت کی تدبیریں کرتا ہے اور انہیں حقیقت کا لبادہ اوڑھاتا ہے مختصراً یہ کہ دل چاہتا ہے اور دماغ سوچتا ہے۔دل میں خواہش اور امنگ پیدا ہوتی ہے دماغ اس کی تکمیل کے لئے غور وفکر کرتا ہے۔ تراکیب سوچتا ہے اور لائحہ عمل طے کرتا ہے اور حصول مقصد کے لئے راہیں متعین کرتا ہے یوں دونوں کے اشتراک عمل سے زیست بسر ہوتی ہے۔اگر دونوں میں خدانخواستہ ہم آہنگی نہ ہو تو مقاصد کا حصول ممکن نہیں رہتا۔یاد رہے کہ صدائے دل پر لبیک نہ کہنا یا دماغ کے کہنے پر کان نہ دھرنا اِنسان کو الجھن میں ڈال دیتا ہے اس صورت میں بالآخر اِنسان کو عقل وفکر کی زنجیروں کو توڑ کر دل کی بات کو صاد کہنا پڑتا ہے کیونکہ دل نتائج سے بے نیاز ہو کر کر گزرنے کا قائل ہوتا ہے اور دماغ فکر وتدبر اور نتائج کے خوف وخطر میں ہی الجھا رہتا ہے اور کچھ بھی نہیں کر پاتا۔مگر داناؤں کا یہ بھی کہنا ہے کہ دل کی آواز پر لبیک کہنے والوں کو اکثر ناکامیوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے کیونکہ جب تک دل کی آواز کو عقل کی کسوٹی سے نہ پرکھا جائے اس کی صداقت مشکوک رہتی ہے اور نتائج برعکس

Marfat.com

برآمد ہونے کا خطرہ لاحق رہتا ہے لہٰذا دونوں کی مطابقت حصول مقاصد کے لئے ضروری ہے کیونکہ دونوں کی شتر بے مہاری سے اِنسان راہ بھٹک کر رہ جاتا ہے۔

عشق کا تعلق دل سے ہے اور عقل کا دماغ سے۔ دل محبت کا گہوارہ ہے اور دماغ علم و عقل کا مینارہ ہے۔ دل میں گہرائیاں اور پہنائیاں ہوتی ہیں اور دماغ کو علو خیالی اور پرواز فکر بلند ہوتی ہے مختصراً دماغ سوچنے کا عادی ہے اور دل کر گزرنے کا قائل ہوتا ہے بقول شاعر:

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق عقل ہے محوِ تماشائے لب بام ابھی

دل والے دل کی زبان سمجھتے ہیں اور اسی کی بات مانتے ہیں دماغ کی بالکل نہیں سنتے اور صاحبانِ دماغ اپنے تئیں عقل کل سمجھتے ہیں۔ وہ اپنی ہی ہانکتے ہیں اور دل کی بات کو قطعاً خاطر میں نہیں لاتے۔ مگر داناؤں کا یہ کہنا ہے کہ دماغ کی بات کو رد کیا جا سکتا ہے لیکن دل کے فیصلے کو نہیں اور وہی دل حکمت و دانش کا مخزن بن سکتا ہے جو دنیا کی محبت سے خالی ہو۔

دل درد آشنا ہوتا ہے۔ جلد پگھل جاتا ہے اور پسیج جاتا ہے۔ یہ اس کا خاصہ ہے اور خاصہ ہونا چاہیئے مگر بعض پتھر دل لوگ اتنے سخت دل ہوتے ہیں کہ کبھی موم نہیں ہوتے بلکہ سنگ دل ہو کر ظلم و ستم کی نئی نئی صورتوں سے دوسروں پر آفات و مصائب کے پہاڑ توڑتے ہیں۔ خدا ان کی سمترانیوں اور جفا جوئیوں سے ہر کسی کو اپنی پناہ میں رکھے۔

دماغ دار بھی دو طرح کے ہوتے ہیں یعنی سمجھدار بھی اور مغرور بھی کیونکہ جب تک دماغ صحیح رہتا ہے تو سوچ اور سمجھ بھی ٹھیک رہتی ہے لیکن جب دماغ خراب ہو جاتا ہے تو ان کی سوچ اور فکر بگڑ جاتی ہے اور ان میں رعونت آ جاتی ہے اور یوں وہ مغرور و متکبر ہو جاتے ہیں مگر تیز دماغ حضرات بڑے ذہین ہوتے ہیں وہ سوچ اور تدبر سے ہر معاملے کی اونچ نیچ کو جان پرکھ کر ضرورت کے مطابق مناسب قدم اٹھاتے ہیں اور کبھی بد دماغ نہیں ہوتے۔ اور بے مغز لوگ جن کے دماغ میں بھوسہ بھرا ہوتا ہے وہ سوچ سے یکسر عاری اور فکر سے بالکل نابلد ہوتے ہیں۔ وہ معاملات کے مثبت و منفی پہلوؤں پر قطعاً غور نہیں کرتے اس لئے کبھی کچھ نہیں کر پاتے۔

دل میں قوت برداشت ہوتی ہے وہ دکھوں اور غموں کو سہنے کی طاقت رکھتا ہے اور رازوں کا مدفن ہوتا ہے جبکہ دماغ اپنی قوتِ فکر پر نازاں ہوتا ہے۔ وہ اپنے تفکر و تدبر کے بل بوتے پر ہر میدان کو جیتنے کا دعویدار رہتا ہے اور رنج و محن کو سوچ کی ہوائیوں میں رکھ کر اڑا دیتا ہے اور اپنی فکر

Marfat.com

وتحقیق کے رازوں کوافشا کرنے کے لئے بیتاب رہتا ہے۔

ایک دل میں دوسرے دل سے ملنے کی صلاحیت ہوتی ہے جس کی بدولت جب دو دل مِل جاتے ہیں تو باہمی روابط استوار ہو جاتے ہیں مگر خدانخواستہ جب دو دلوں میں نفرت پیدا ہو جاتی ہے تو دوریاں جنم لیتی ہیں اور قربت کے رشتے بھی ختم ہو جاتے ہیں کہتے ہیں کہ دل جب دل پر فدا ہوتا ہے تو سزا بن جاتا ہے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ کوئی کتنا ہی قوی کیوں نہ ہو دل کے ہاتھوں ہار ہی جاتا ہے اور یہ بھی سچ ہے کہ دولت واقتدار کا نشہ اکثر دماغ کو خراب کر دیتا ہے اور عشق ومحبت کا نشہ دل کو مدہوش کر دیتا ہے اور دماغ کو مات دے دیتا ہے۔ یعنیہ دو دماغوں میں باہمی موافقت بھی ممکن ہوتی ہے اور مخالفت بھی۔ موافقت کی صورت میں نتائج مثبت اور بہتر برآمد ہوئے اور مخالفت کی صورت میں دو دماغوں کی لڑائی منفی نتائج پر منتج ہوتی ہے اور بحث وتکرار کی بے کار دماغی جنگ چھڑ جاتی ہے جس سے کچھ حاصل نہیں ہوتا سوائے اس کے کہ دوسروں کے دماغ بھی الجھن کا شکار ہو جاتے ہیں۔

دل اور دماغ کے اس مبحث سے میں نہ تو مزید آپ کے دل کو پریشان کرنا چاہتا ہوں اور نہ آپ کا مزید دماغ ہی کھانا چاہتا ہوں بلکہ اپنی دماغ سوزی کا حاصل بیان کرنا چاہتا ہوں کہ میرے خیال میں ٹھنڈے دل اور ٹھنڈے دماغ سے ہر معاملے میں کام لینا مفید اور موثر ہوتا ہے اور

بزبان شاعر

بہتر تو ہے یہی کہ دل کے پاس رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

Marfat.com

دوستی اور دشمنی

جس طرح دوستی اور دشمنی ایک دوسرے کے نقیض ہیں اسی طرح دوست اور دشمن کے الفاظ بھی ایک دوسرے کے متضاد ہیں۔ دوستی آشنائی خیر خواہی اور عشق و محبت سے عبارت ہے جبکہ دشمنی کا مفہوم عداوت، مخالفت اور بدخواہی ہے۔ اسی طرح دوست اور دشمن کے اوصاف و خواص ایک دوسرے کے الٹ ہیں دوست حلیف ہوتا ہے اور دشمن حریف۔

دوستی محبت ہے اور دشمنی دشنام ہے۔ دوستی پیغام محبت ہے اور دشمنی دشنام طرازی کے سوا کچھ نہیں مگر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ "بے وقوف دوست سے عقلمند دشمن بہتر ہوتا ہے" ہوتا ہوگا، زیادہ عقلمندوں کے نزدیک مگر مجھ جیسے کم عقل تو یہی سمجھتے ہیں کہ دوست دوست ہوتا ہے اور دشمن دشمن۔ ان کا کیا تقابل؟ اور بعض کم فہم یہ بھی کہتے ہیں کہ "دوست کی دوستی سے غرض اس کے عیبوں سے کیا؟ مگر میرے نزدیک یہ دوستی دشمنی کے مترادف ہے کیونکہ دوست دوست کا بہی خواہ ہوتا ہے لہٰذا ایسی کہاوت بعید از قیاس ہے اس سے دوستی کے صحیح مفہوم (خیر خواہی) سے انکار ہے میں تو یہ کہوں گا کہ ایسے خیال سے دوستی کا بھرم ہی اٹھ جاتا ہے۔ یہ کہاوت سراسر خود غرضی کی مظہر ہے کیونکہ اگر دوست کی بہتری اور بھلائی پیش نظر نہ رہے تو ایسی دوستی چہ معنی دارد؟ ایسی دوستی دوستی نہیں خود غرضی اور مطلب پرستی ہے بلکہ دشمنی کو بغل میں دبانا ہے۔

اس ضمن میں میں تو فارسی کے اس مقولے کا داعی ہوں کہ "دوست باشد کہ از مصائبِ دوست، ہم چوں آئینہ روبرو گوید"

یعنی دوست وہ ہوتا ہے جو دوست کے عیب اس کے روبرو کہے۔

دوست خستگی اور ماندگی میں مددگار ہوتا ہے جبکہ دشمن ایسی کیفیت سے فائدہ اٹھا کر دشمن کی مضرت رسانی کے اسباب اور طریق ڈھونڈ کر اپنی دشمنی کی آگ بجھانے کی کوشش کرتا ہے۔ بس یہی دوستی اور دشمنی کا تفاوت ہے اور یہی دوست اور دشمن کی پہچان۔

بقول شاعر:

Marfat.com

دوست آں باشد کہ گیرد دستِ دوست
در پریشان حالی و درماندگی

دشمن تو دشمن ہوتا ہی ہے مگر دوست نما دشمن اصل دشمن سے کہیں زیادہ خطرناک ہوتا ہے کیونکہ دوستی کا بھرم اور دعویٰ اس کے اصلی چہرے سے نقاب اٹھانے نہیں دیتا۔ اس کی بے نقابی میں دوستی کے تقاضے حائل رہتے ہیں اور اس کی پہچان بھی بڑی مشکل ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ جو لوگ ایسے دوست کو جان جاتے ہیں اور اس سے چھٹکارا پا لیتے ہیں وہ عافیت میں رہتے ہیں کیونکہ " گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے " کے مصداق وہ دشمن جاں ثابت ہوتا ہے مگر یہ اور بات ہے کہ عاشق لوگ خواہ مخواہ میں اپنے محبوب کو دشمن سمجھتے اور گردانتے ہیں۔

کہتے ہیں کہ حسد دشمنی کو جنم دیتا ہے مگر میں کہتا ہوں کہ لالچ حسد سے بڑھ کر دشمنی پیدا کرنے کا سبب بنتا ہے۔ حسد کی آگ میں جل کر دشمنی کی آگ یقیناً بھڑکتی ہے مگر لالچ سے پید اشدہ دشمنی کی آگ اِنسان کو جلا کر راکھ کر دیتی ہے کیونکہ نہ کبھی اس کا لالچ پورا ہوتا ہے اور نہ کبھی دشمنی ہی ختم ہو سکتی ہے۔ ایسا لالچی دشمن خود آپ بھی اپنا دشمن ہوتا ہے۔ عاشق لوگ بھی عشق کے لالچ میں اسی طرح خود اپنے دشمن بن کر رہ جاتے ہیں دونوں صورتوں میں آپ اپنا دشمن بننا کوئی عقلمندی کی بات نہیں۔

اِنسان آپ بھی اپنا دشمن ہوتا ہے اور اس کے اپنے بھی دشمن ہوتے ہیں سچ ہی تو کہا جاتا ہے کہ "دشمن کون؟ ماں کا پیٹ" یا پھر یوں کہا جاتا ہے "دشمن کہاں بغل میں" مگر دشمن اپنا ہو یا بیگانہ چھوٹا ہو یا بڑا دشمن ہی ہوتا ہے اسے کبھی حقیر یا کم نہیں سمجھنا چاہیئے اس سے ہمیشہ خوفزدہ رہنا چاہیئے اور اس کی دشمنی سے بچنے کے لئے خدا کی پناہ مانگنی چاہیئے کیونکہ دشمن اگر قوی است نگہبان قوی تر است۔

دوست اور دشمن بنانا اِنسان کے اپنے بس میں ہے۔ وہ بہت سے دوست بھی بناتا ہے اور دشمن بھی۔ مگر اِنسان کا سب سے بڑا دوست خدا ہے اور سب سے بڑا دشمن شیطان ہے۔ بڑے دوست کی ایک ہی خوبی ہے جو حقیقی دوستی سے عبارت ہے جبکہ بڑے دشمن کی شیطنت کے کئی روپ ہیں خدا کی مہربانیوں سے ہی اِنسان اس دشمن کی زد سے محفوظ رہتا ہے سچ ہی تو ہے کہ "دشمن چہ کند چوں مہرباں باشد دوست"

Marfat.com

قحط الرجال کے اس دور میں دشمن تو بے شمار ہیں اور دوست بہت کم ہیں اور اچھے دوست تو کمیاب بلکہ نایاب ہیں۔ دوست بنایئے اور ضرور بنایئے کیونکہ یہ معاشرتی زندگی کا تقاضا بھی ہے اور ضرورت بھی ____ مگر سوچ سمجھ کر اور جان پرکھ کر ____ اور بزرگوں کی اس نصیحت کو بطور خاص پیشِ نظر رکھیئے کہ "اجنبیوں سے بے تکلفی اور دوستی سے اجتناب کرنا چاہیئے" ____ دوست نماؤں اور دشمن نما دوستوں سے بچیئے۔ خود دوست نواز بن کر دوست دار بنیئے اور دوستانہ نبھایئے تاکہ دوستی پر کوئی دوس نہ آنے پائے ____ فارسی مثل" دوست قدیم شراب کہنہ" کے مطابق قدیم دوستوں کی دوستی کی قدر کیجئے۔ ان سے دوستی نبھایئے اور کوشش کیجئے کہ دوستی کا بھرم ہمیشہ قائم رہے، اس کا تقدس برقرار رہے اور اسے کوئی آنچ نہ آنے پائے لیکن یاد رکھنے والی بات یہ ہے کہ نادان کی دوستی جی کا جنجال، جھوٹے کی دوستی دشمنی، کنجوس کی دوستی بے فائدہ اور بدکار کی دوستی بدنامی کا باعث ہوتی ہے۔

اچھے دوست عطیہ خداوندی ہیں انہیں غنیمت جانیئے۔ ان سے اچھا سلوک کیجئے۔ ان کے خلاف کبھی کچھ مت سنیئے۔ ان کو آزمائش میں نہ ڈالیئے۔ ان سے کبھی حساب نہ لیجئے اور نہ کیجئے کیونکہ فارسی والوں کا کہنا ہے کہ "حساب دوستاں در دل"۔ ضرورت میں ان کے کام آیئے مگر ان پر کبھی احسان نہ جتایئے۔ دوستانے میں حد سے زیادہ ہنسی مذاق سے پرہیز کیجئے کیونکہ داناؤں کا کہنا ہے کہ "ایسی ہنسی اچھی نہیں جس سے دوستی میں فرق آئے"۔

آخری بات یہ کہ بلاشبہ خدا ان کو دوست رکھتا ہے جو اس کے بندوں سے پیار کرتے ہیں مگر بقول قرآن خدا تعالیٰ جن لوگوں کو ہرگز دوست نہیں رکھتا ان میں سے کچھ ایسے ہیں:

زیادتی کرنے والے، ظلم کرنے والے، تکبر کرنے، امانت میں خیانت کرنے والے، جرم کا ارتکاب کرنے والے، بڑائی مارنے والے، فساد کرنے والے، حد سے بڑھنے والے، بے جا خرچ کرنے والے، دغاباز سرکشوں اور کفران نعمت کرنے والے۔

دانشمندوں کے یہ فرمودات بھی قابلِ غور ہیں کہ:

۱۔ دوستی ایک لازوال جذبہ اور پاکیزہ عمل ہے۔

۲۔ دوستی خلوص کے رشتے کا نام ہے۔

۳۔ دوستی ایک مقدس رشتہ ہے جس کی بنیاد اعتماد اور یقین پر ہوتی ہے۔

Marfat.com

۴۔ دوستی کرنے سے پہلے صورت نہیں سیرت کو دیکھئے۔
۵۔ ہر ہاتھ ملانے والے کو دوست نہ سمجھو۔
۶۔ دوستی ایک ایسا پھول ہے جو اِنسان کو شگفتگی بخشتا ہے۔
۷۔ دوستی ایک ایسا احساس ہے جو اِنسان کے دماغ کو تازگی دیتا ہے۔
۸۔ دوستی ایک ایسا سمندر ہے جس کی گہرائی نا قابلِ پیمائش ہے۔
۹۔ دوستی ایک ایسی روشنی ہے جس کے سامنے باقی حصّے دھندلاتے ہیں۔
۱۰۔ دوستی ایک پاکیزہ شمع ہے جو انسان کو غم کے اندھیروں سے نکال کر روشنی میں لا کھڑا کرتی ہے۔
۱۱۔ دوستی ایک ایسی دھنک ہے جو کہ ساتوں خوبصورت رنگوں کا مجموعہ ہے۔
۱۲۔ دوست ہزار بھی کم ہیں اور دشمن ایک بھی زیادہ۔
۱۳۔ اس دوست کا کیا فائدہ جو مجلس میں تمہاری پگڑی اچھالے خواہ وہ مذاقاً ہی کیوں نہ ہو۔
۱۴۔ دوستی اور دشمنی کے چلن نبھانے کا جسے ڈھنگ آجائے وہی کامیاب ہوتا ہے۔
۱۵۔ کسی کی دوستی اچھی نہ کسی سے دشمنی اچھی۔
۱۶۔ جو دوست دوست کے عیب دیکھتا ہے وہ کسی کا دوست نہیں ہوسکتا۔
۱۷۔ دشمن بننے کے لئے دوست بننا پڑتا ہے اور اگر دشمن دوست بن جائے تو پھر وہ اور بھی بڑا دشمن بنتا ہے۔

مگر

میرا تو یہ مشورہ ہے کہ:
دوست کے دشمن کو اپنا دوشمن اور دشمن کے دشمن کو اپنا دوست سمجھنا چاہیئے۔آخر میں ان خیالات کو اس دعا پر ختم کرتا ہوں کہ:

دوست شاد ہوں اور دشمن پائمال رہیں ــــــــ اور
دوست ملے کھاتے، دشمن ملے روتے

Marfat.com

دہن اور ذہن

دہن منہ کو اور ذہن دماغ کو کہتے ہیں۔ دہن اور ذہن دونوں جسم کے اہم جزو ہیں۔ تحریر میں ان کے مابین صرف نقطے کا فرق ہے۔ دہن کی دال پر اگر نقطہ لگا دیں تو وہ ذہن بن جاتا ہے اور اگر ذہن کی ذال سے نقطہ ہٹا دیں تو وہ دہن رہ جاتا ہے مگر دونوں کے اشتراک عمل سے تعمیری اور تخریبی ہر دو طرح کے کام لئے جا سکتے ہیں۔

دہن میں زبان ہے اور ذہن میں مغز۔ زبان دہن میں محفوظ ہے اور ذہن کھوپڑی میں۔ زبان بولنے اور مغز سوچنے کے لئے عطیاتِ خداوندی ہیں۔ نطق و فکر کی اسی صلاحیت کے باعث اِنسان کو تمام مخلوقات پر تفوق حاصل ہے۔

ذہنی پختگی اور کشادگی اِنسان کو دانشور اور وسیع النظر بناتی ہے مگر دہن کی کشادگی اور بندش دونوں اِنسان کی تذلیل اور توقیر میں کمی و بیشی کا سبب ہے۔ یاد رہے کہ مالی اور جنسی ترغیبات ذہنی آلودگی کا باعث ہیں اور بدگوئی و بدزبانی دہن کی آلودگی کا باعث ہیں لہٰذا ہر دو سے پرہیز بہتر ہے کیونکہ ذہنی بالیدگی کے لئے ذہن میں اچھے اچھے خیالات پیدا کرنا اور پاکیزگیٔ دہن کیلئے دہن کو اچھی گفتار سے آراستہ کرنا، ایسے اوصاف ہیں جو اِنسان کی مقبولیت اور نیک نامی کا باعث ہیں۔

کہتے ہیں کہ کسی کا منہ نہیں کھلوانا چاہیئے اور جیسے بھی ممکن ہو دوسروں کا منہ بند رکھنے کی کوشش فائدہ مند ہے مگر سچ اور حق کے لئے منہ بند رکھنا اور زبان نہ کھولنا کمزوری اور بے بسی کی علامت ہے اور حقائق سے روگردانی اور چشم پوشی کے مترادف ہے مگر زبان بندی کا حکومتی جبر حق و انصاف کے سراسر منافی قرار دیا جاتا ہے کیونکہ اس میں سیاسی مفادات کو پیش نظر رکھا جاتا ہے یوں اسے حکمرانی کا ایک حربہ تصوّر کیا جاتا ہے اور صدائے حق کے گلہ گھونٹنے کے مترادف خیال کیا جاتا ہے۔

اور یہ بھی سچ کہا گیا ہے کہ

زباں اپنی حد میں ہے بے شک زباں
بڑھے ایک نقطہ تو ہے یہ زیاں

Marfat.com

واقعی دریدہ دہن (منہ پھٹ) ہونا گستاخی اور بے شرمی کی بات ہے۔لیکن مصلحت کی خاطر یا اخفائے راز کے لئے منہ بند رکھنا بہر نوع مستحسن ہے البتہ بمصداق "دہن سگ از لقمہ دوختہ بہ" کسی شخص کی ایذا رسانی سے محفوظ رہنے کے لئے اگر کچھ دے دیا جائے تو اس میں کچھ قباحت بھی نہیں۔

ذہن جیسا کہ اوپر مذکور ہے قوتِ ادارک اور ذہانت و ذکاوت کا نام ہے اس لئے ضروری ہے کہ ہر کام کے لئے ذہن لڑانا چاہیئے اس سے ذہن کھلتا ہے اور طبع تیز ہوتی ہے اور تیز فہم آدمی عقلمند اور دانشور کہلاتا ہے اور ہر بات بہت جلد اس کے ذہن نشین ہو جاتی ہے اور کند ذہن آدمی چونکہ ان صفات سے عاری ہوتا ہے اس لئے کم عقل اور احمق سمجھا جاتا ہے۔ المختصر ذہن (دماغ) یادوں کا ذخیرہ، سوچوں کا مرکز اور کوشش و کار کی منصوبہ بندی کا کارخانہ ہے۔

پس ضرورت اس امر کی ہے کہ عقل و ذہانت سے اپنے ذہن کو صیقل کیا جائے تا کہ فکر و دانش کو جلا ملے اور کبھی کوئی بات ذہن سے اترنے نہ پائے اور اس مقولہ کے مطابق کہ ''ذہین کی دور بلا'' وہ دوسروں کے شر اور نقصان سے بچا رہے۔اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی یاد رہے کہ سوچ و فکر کی اس صلاحیت کی بدولت دہن کو خوش گفتاری کا وصف ملتا ہے جو ''سونے پر سہاگہ'' کے مترادف ہے۔

Marfat.com

دھرم اور دھڑا

دھرم سنسکرت کا لفظ ہے۔ ہندی میں مت اور پنتھ کے الفاظ اس کے متبادل استعمال ہوتے ہیں۔ عربی میں دین اور انگریزی میں Religion کہتے ہیں یہاں یہ بات وضاحت طلب ہے کہ مذہب اور پنتھ کے معنی چلنے کی جگہ، راہ، طریقہ، کیش، مشرب یا فرقہ ہیں جبکہ دین اور دھرم ایمان، یقین اور عقیدہ کو کہتے ہیں۔

دھڑا ہندی کا لفظ ہے جو دو مختلف معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اولاً وزن (پانچ سیر کا وزن، دس سیر کا باٹ، پاسنگ یعنی برابر کرنے کا وزن) اور ثانیاً گروہ، جتھا، جماعت یا فریق کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ عربی میں انہے حزب کہتے ہیں اور انگریزی میں اس کا متبادل لفظ Party ہے جو بین الاقوامی لفظ کے طور پر ہر زبان میں استعمال کیا جاتا ہے۔

ہر قوم کا ایک دھرم ہوتا ہے اور اس کا دھرم ہی اس کی قومیت کی شناخت ہوتا ہے۔ نسل، رنگ یا وطن کسی قوم کی پہچان کا باعث نہیں بنتے۔ ایک سا عقیدہ رکھنے والے لوگ چاہے وہ دنیا کے کسی حصے میں رہتے بستے ہوں مل کر قوم کی تشکیل کرتے ہیں۔ ہر قوم کی ایک عبادت گاہ ہوتی ہے جسے الگ الگ ناموں سے پکارا جاتا ہے مثلاً مسجد، حرم، کلیسا (گرجا) گوردوارہ، دیر، مندر وغیرہ۔

ہر دھرم کا ایک نبی، اوتار یا بانی ہوتا ہے۔ ہر دھرم کی ایک مذہبی کتاب ہوتی ہے۔ ہر دھرم کے عالم وعظ کے ذریعے سے اس کی تبلیغ و اشاعت کرتے ہیں۔ ایسے مبلغین، ناصحین اور واعظین کو ہندی میں دھرم اپدیشک کہتے ہیں اور ان کے وعظ کو دھرم اپدیش کہتے ہیں۔ دھرم کی نسبت سے ہی پابند مذہب کو دھرم دھاری، پارسا کو دھرم چاری اور عالم دین کو دھرم گیانی کہتے ہیں۔ ان کی مذہبی کتابیں دھرم شاستر کہلاتی ہیں۔ وہ اپنے معاشرے کو دھرم سماج اور مذہبی مجلس کو دھرم سبھا اور رسم کو دھرم ریت کہتے ہیں۔ سلطنت اور منصف بادشاہ کو دھرم راج کہتے ہیں۔ سخی کو دھرم آتما، قانون کے محافظ کو دھرم رکھشک اور خیراتی سرائے کو دھرم سالا کہتے ہیں۔ زوجین کو دھرم پتی اور دھرم پتنی کہتے ہیں۔ منہ بولے باپ کو دھرم باپ اور منہ بولے بیٹے کو دھرم بیٹا کہتے ہیں۔ سچ

Marfat.com

ثابت کرنے کے یا پختہ وعدہ کرنے کے لئے دھرم کی قسم کھاتے ہیں۔

ہر دھرم بنیادی طور پر "اِنسان" کو Focus کرتا ہے۔ وہ رواداری اور بھائی چارے کا درس دیتا ہے۔ پارسائی اور نیکی کا سبق دیتا ہے۔ دھرم مکمل ضابطہ حیات ہوتا ہے جو طرز ہائے زندگی کی راہیں متعین کرتا ہے۔ یہ ہم خیالی، امن، ہم آہنگی، اتحاد، یکجہتی اور باہمی روابط کو فروغ دیتا ہے۔ یہ مخالفت اور مخاصمت کے بجائے دوسروں سے انس و محبت کا درس دیتا ہے۔

دھرم کے بتائے ہوئے اصولوں پر چلنا اور اس کے احکامات کو بجالانا دھرم کی شرطِ اوّل ہے۔ اس سے روگردانی، فرار اور انکار مذہب سے اخراج کا باعث بنتا ہے۔ پابندیٔ احکام میں وفاداری اور استواری لازم ہے۔ اس میں ڈھیل اور لچک کی قطعاً گنجائش نہیں ورنہ دھرم میں کاملیت اور استحکام پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن دھرم دھاریوں کا کٹر پن، تنگ نظری اور تعصب بین المذاہب نفرت، بیر اور دشمنی کو ہوا دیتا ہے۔

مذہب میں فرقہ بندی اس کے زوال کا باعث ہوتی ہے کیونکہ یہ انتہا پسندی کی حد کو چھو کر ہم مذہبوں کو پارہ پارہ کر دیتی ہے اور باہمی تصادم کا باعث بنتی ہے جو مذہب اور قوم ہر دو کے لئے نقصان دہ ثابت ہوتی کیونکہ فرقہ واریت (جو محض تنگ نظری کی پیداوار ہے) انفاق و منافرت کا وہ بیج بوتی ہے جس سے ایسا انتشار پھیلتا ہے کہ قوم و ملّت کا شیرازہ بکھر جاتا ہے۔ فرقے معمولی معمولی اختلافات پر بپھر کر ایک دوسرے سے دست و گریبان ہونے لگتے ہیں اور بڑھتے بڑھتے ان کا الجھاؤ جنگ و جدال اور قتل و غارت تک جا پہنچتا ہے جسے ہر فرقہ مقدس جنگ اور جہاد سمجھتا ہے جس میں جان سے ہاتھ دھو بیٹھنے کو وہ شہادت کا درجہ سمجھتا ہے اور نجات اخروی کا ذریعہ گردانتا ہے حیف ہے کہ یہ لوگ قطعاً نہیں سوچتے کہ فرقہ پرستی سے نہ تو ان کے فرقے کو کوئی فروغ ملتا ہے اور نہ مذہب کی من حیث الجمع کوئی خدمت ہوتی ہے بلکہ الٹا اس سے قوم کو مذہبی اور جانی لحاظ سے ناقابلِ تلافی نقصان پہنچتا ہے اور بین المذاہب تصادم کی صورت میں تو اس کے نتائج اور بھی ہولناک بھیانک اور تباہ کن ثابت ہوتے ہیں لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ نہ صرف بین المذاہب گروہ بندی سے اجتناب کیا جائے بلکہ اندرون مذہب بطور خاص فرقہ واریت کی آگ کو سلگنے اور دہکنے سے ہر چند روکا جائے۔ اس کے لئے اس ماٹو کو اپنانا نسخۂ کیمیا ہے کہ "موسیٰ بدین خود، عیسیٰ بدین خود" کیونکہ ہر فرد کو مرضی کا مذہب اختیار کرنے کا حق ہے۔ اس لیے "حق دو اور حق

Marfat.com

لو" کے مصداق "جیئو اور جینے دو" کی پالیسی پر عمل پیرا ہونا چاہیئے۔

اگرچہ ہر پیدا ہونے والا شخص اپنے آباء واجداد کے دین کو اختیار کرنے پر مجبور ہوتا ہے تاہم سن شعور کو پہنچ کر مختلف مذاہب کے مطالعہ اور تقابلی جائزہ لینے کے بعد عقل سلیم سے بہتر مذہب کا انتخاب کرنا چاہیئے۔ اس اختیار پر قدغن یا مجبوری نہیں ہونی چاہیئے اور ایک بار انتخاب کردہ مذہب کو تبدیل کرنا فطری استقلال کے خلاف ہے لیکن کسی کو مذہب تبدیل کرنے پر مجبور کرنا انتہائی بلکہ سراسر ظلم ہے اور ہاں کسی لالچ کی خاطر مذہب کی تبدیلی تو صریحاً فعل قبیح ہے۔

دھڑا جیسے کہ اوپر ذکر ہوا اپنے اندر تقسیم اور گروہ کا مفہوم رکھتا ہے۔ اس لحاظ سے اگر غور کریں تو پتہ چلتا ہے کہ بنی نوع انسان بقائے باہمی کے لئے مختلف صورتوں میں منقسم ہے مثلاً رنگ و نسل، حسب و نسب، دین و مذہب، قوم و قبائل، معاشرتی طبقات، حکومتی نظاموں اور وطنوں میں۔

تمام قسم کے دھڑے "اپنی ڈفری اپنا راج" کے مصداق زندہ و پائندہ رہنے میں کوشاں ہیں اور اپنے اپنے مفادات کی خاطر آپس میں شیر و شکر بھی رہتے ہیں اور دست و گریباں بھی اور اکثر اوقات باہم متصادم و متحارب بھی ہو جاتے ہیں۔

علمی، ادبی، سیاسی اور فلاحی انجمنیں اور تنظیمیں اپنے اپنے پلیٹ فارم پر اپنا اپنا راگ الاپتی ہیں اور ہمیشہ جذبۂ مسابقت کے تحت ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی لگن میں مگن رہتی ہیں اور ہر نوع اپنے جذبۂ خدمت کا لوہا منوانا چاہتی ہیں۔ اپنی برتری اور ناموری کی خاطر ایک دوسرے کے عیوب و نقائص کی ٹوہ میں رہتی ہیں اور انہیں ہوا دے کر اور ان کے کاموں میں کیڑے نکال کر ہمیشہ تنقید کے تیر چلاتی رہتی ہیں۔

کوئی رنگ و نسل کے تفوق پر فخر کرتا ہے۔ کوئی چھوٹے طبقوں کو ہیچ جانتا ہے۔ کوئی قوم پرست ہے۔ کوئی وطن پرست ہے۔ کوئی اقتدار پسند ہے اور کوئی زر پسند۔ کوئی خدا پرست ہے اور کوئی مظاہر پرست۔ کوئی بت پرست ہے اور کوئی پیر پرست۔ کوئی آگ، سورج یا چاند کو پوجتا ہے اور کوئی بتوں کو۔ کوئی سانپوں کو دیوتا سمجھتا ہے اور کوئی گائے کو ماں کہہ کر اس کی پرستش کرتا ہے۔ نائب خدا کی یہ خدا سازی میری عقل سے تو ماورا ہے۔ میرے خیال سے انسانی عقل و فہم کے اس عطیۂ ایزدی کی ناشکری ہے جس کی بدولت اسے اشرف المخلوقات اور نیابتِ الٰہی کا شرف و منصب عطا ہوا ہے۔

Marfat.com

چوروں، لٹیروں اور سمگلروں کے گینگ، دہشت گردوں اور قبضہ گروپوں کے گروہ، آزادی کی خاطر لڑنے والوں کے جیش و جتھے، مجاہدین کے لشکر، منگتوں اور گداگری کی ٹولیاں اور فنکاروں اور گویوں کی پارٹیاں سب کے سب دھڑے ہی تو ہیں چاہے وہ کسی کی نظر میں اچھے ہوں یا بُرے مگر متعلقہ گروہوں کے نزدیک حصول مقاصد کیلئے بالکل جائز و صحیح اور مفید و کارآمد سمجھے جاتے ہیں۔

اِنسانوں کے علاوہ چرند پرند اور نباتات و حیوانات یہاں تک کہ عبادات بھی بلحاظ خواص اثرات اور فوائد و نقائص باہم منقسم ہیں۔ انکی یہ تقسیم بھی دھڑا بندی کے زمرے میں ہی شمار ہوتی ہے۔

سب دھڑے، گروہ بندیاں اور انجمن سازیاں اتحاد و یگانگت کی بدولت تشکیل پذیر ہوتی ہیں اور اپنے مخصوص مقاصد کے حصول کے لئے قائم و دائم رہتی ہیں لیکن سیاست اور مذہب میں پارٹی بندیوں اور فرقہ بندیوں کی کرشمہ سازیوں کی خطرناکیوں کی مثالیں اپنی مثال آپ ہیں۔ اگرچہ سیاسی پارٹیوں کی شیرازہ بندی سیاست کاری کی بنیادی ضرورت ہے اور حصول اقتدار کی لازمی شرط ہے لیکن ان کی باہمی مخالفت و مبارزت اکثر اوقات جانی و مالی نقصان کے علاوہ انقلابات کا باعث بھی بنتی ہے۔ عوامی مسائل بڑھتے ہیں اور امن وانصاف کے حصول میں دشواریاں پیش آتی ہیں۔

حاصل کلام یہ کہ دین (مذہب) خالصتہً نجی معاملہ ہے اس میں عبد و معبود کا براہِ راست تعلق ہوتا ہے۔ اس کے دستور العمل کی پابندی اہلِ مذہب پر لازم ہے۔ اس سے زندگی منضبط ہوتی ہے اور رہتی ہے مگر اس کی پابندیوں میں آسانیاں بھی ہیں لیکن دھڑے کے اصول و قواعد سخت ہوتے ہیں۔ اس کا ضابطۂ عمل بڑا کڑا اور مشکل ہوتا ہے گروہی، سیاسی اور دیگر دھڑوں کے ضابطۂ اخلاق میں رکن کو رائے کا حق تو ملتا ہے مگر مرضی کے فیصلے اور اس کے عمل درآمد کا نہیں۔ اس کی پابندیوں میں سختیاں بڑی کڑی ہوتی ہیں۔ پارٹی پالیسیوں کی خلاف ورزیاں بغاوت تصوّر کی جاتی ہیں اور پارٹی سے اخراج کا سبب بنتی ہیں۔ اسی لئے تو کہتے ہیں کہ "دھرم سے دھڑا رکھنا/ پالنا مشکل ہے" جس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ دھڑے سے دھرم بہتر ہے۔ میرا مشورہ تو بس یہی ہے کہ نہ اپنے دھرم کو چھوڑیں اور نہ کسی کے دھرم کو چھیڑیں اور دھڑے بندی سے ہر چند اجتناب کریں اور اگر آپ دھڑے کے بغیر نہیں رہ سکتے تو سوچ سمجھ کے بعد صرف ایک دھڑے کا ہی انتخاب کریں اور اسے کبھی نہ بدلیں ورنہ "لوٹا" کے لقب سے ملقب ہو کر رہ جائیں گے۔

Marfat.com

دھمکی اور دھما کا

دھمکی اور دھما کا آپس میں بہن بھائی ہیں۔ بہن چھوٹی ہے اور بھائی بڑا ہے۔ ظاہر ہے کہ چھوٹا محکوم ہوتا ہے اور بڑا حاکم ہوتا ہے۔ اگر تذکیر و تانیث کے حوالہ سے بھی دیکھا جائے تو مونث مذکر کے ہی زیرِ نگیں ہوتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ بعض زور آور، چالاک اور ہوشیار اناث کم ہمت، بزدل اور نکھٹو قسم کے ذکور پر اپنی حکمرانی کا سکّہ جمایا بٹھا لیتی ہیں مگر وہ نہایت ہی خال خال ہیں، محدودے چند آٹے میں نمک کے برابر مگر ہوتی ضرور نمکین و ملیح ہیں۔ آیئے اب ذرا ان کی اصلیت و ماہیت کا احاطہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں:

دھمکی ڈرا کر کام نکالنے کا حربہ ہے۔ یہ سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ نظام کا موثر و کارآمد طریقِ کار ہے۔ اس میں للکار اور چیلنج کا عنصر بھی شامل ہوتا ہے۔ بین الاقوامی تنازعات و معاملات کے حل یا مفاد کے حصول کی خاطر معاشی، معاشرتی اور سیاسی پابندیوں کی دھمکیاں اگر کارگر نہ ہوں تو یہی دھمکیاں اعلانِ جنگ کے مترادف ثابت ہوتی ہیں۔ مختصراً دھمکی دھونس اور دباؤ کا دوسرا نام ہے۔ اور

دھما کے سوچی سمجھی سکیم کے تحت کئے جاتے ہیں ان سے دہشت گردی عیاں ہوتی ہے اور لوگوں میں خوف و ہراس پھیلتا ہے۔ حکومتوں کو ہراساں و پریشان کر کے ان کو زیر کرنے یا ان کے خاتمے کی کوشش کی جاتی ہے اور انقلاب برپا کرنے کا مقصد پیشِ نظر ہوتا ہے مگر شادی بیاہ کے موقع پر خوشی کے شادیانے بجانے کے ساتھ ساتھ آتش بازی اور کریکرز سے دھما کے کر کے مسرت و شادمانی کا اظہار کیا جاتا ہے۔ اسی طرح مقررین، خطیب اور صحافی حضرات بھی اپنی تقریروں، واعظوں اور تحریروں میں تنقید و تنقیص کے ذریعے اکثر بڑے بڑے دھما کے کرتے رہتے ہیں مگر زمانے کی رفتارِ ترقی کا اندازہ کیجئے کہ دھما کے انتہا پسندوں اور دہشت گردوں کا معمول بن چکے ہیں اور ستم ظریفی یہ کہ دھما کے مختلف روپ دھارتے دھارتے بم دھماکوں کی شکل اختیار کر چکے ہیں اور ستم بالائے ستم یہ کہ خود کش بم دھما کے اپنے

Marfat.com

بیگانوں، دوستوں، دشمنوں، گنہگاروں، بے گناہوں، بوڑھوں بچوں اور معصوموں تک کی بلا تخصیص ہلاکتوں کا باعث بن رہے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ان جان لیوا بم دھماکوں کے سدِّ باب کے لئے اِنسانی بنیادوں پر متحدہ اور متفقہ کوششوں کو بروئے کار لا کر نسلِ اِنسانی کے اتلاف کو مؤثر انداز میں روکا جائے چاہے اس کے لئے قانون سازی کے علاوہ حرب وضرب سے ہی کیوں نہ کام لینا پڑے تا کہ اِنسان کش دھماکوں کے افراد اور گروہوں کو نیست و نابود کر کے ان کی درندگی، وحشت اور بربریت کا خاتمہ ہو سکے اور حیاتِ اِنسانی کے تحفظ، بقا اور سلامتی کو یقینی بنایا جا سکے۔

دھمکی اور دھماکے کی تفریق و تخصیص کے لئے یاد رکھیئے کہ دھمکی میں رعب اور دباؤ کا پہلو زیادہ ہوتا ہے مقصد ڈرا کر کام لینے یا کام نکالنے کا ہوتا ہے۔ مقصد برآری کے لئے تھوڑا بہت جبر بھی روا سمجھا جاتا ہے اور بعض اوقات دھمکی کو محض گیدڑ بھبکی سمجھ کر در خود اعتنا بھی نہیں سمجھا جاتا ہے اور اسے مجذوب کی بڑ سمجھ کر رد کر دیا جاتا ہے اور یوں دھمکی سچ ثابت ہونے کے بجائے بے جان بلکہ مردہ بن کر رہ جاتی ہے۔ دھمکی مصنوعی اور عارضی بھی ہوتی ہے اور سچی اور جھوٹی بھی۔ سچی دھمکی کو جھوٹی اور جھوٹی دھمکی کو سچ کر دکھانا دھمک کاروں کا کمال سمجھا جاتا ہے۔ اگر چہ جمہوریت میں جبر بھی دھمکی کی ذیل میں آتا ہے لیکن پولیس کی دھمکی میں دھمکی کا اصل مفہوم واضح ہوتا ہے مگر

دھماکے میں ڈر اور جبر کے علاوہ جور و ستم کا پہلو زیادہ ہوتا ہے جو تباہی و بربادی اور ہلاکتوں پر منتج ہوتا ہے۔ دھمکی کا اثر ہر لحاظ سے اجتماعی اور بلا تخصیص ہوتا ہے تاہم یہ امر مسلّم ہے کہ دھمکی اور دھماکے دونوں سے تباہی پھیلتی ہے۔

مختصراً میری رائے میں دھمکی دباؤ ڈالنے اور مرعوب کرنے تک محدود رہنی چاہیئے۔ ایسا کرنے سے اگر مطلوبہ مقاصد حاصل نہیں تو چپ سادھ لینے میں عافیت ہے مگر دھماکوں کی استعماریت، بربریت، سیہ کاریاں، بلاخیزیاں اور جارحانہ و وحشیانہ مظالم ہرگز ہرگز قابلِ قبول نہیں۔

Marfat.com

دھوکا اور فریب

دھوکا اور فریب دونوں مذکر اور ہم معنی ہیں انگریزی میں اس کا متبادل فراڈ ہے جو اپنی وسعت کار سے ان دونون سے بھاری اور بڑھ کر ہے۔

دھوکا اور فریب ایک چکر ہے جس کے چنگل میں ہر کوئی آجاتا ہے شاطر اور عیار لوگ مکر اور دھوکے کا چکر چلا کر سادہ لوحوں کو اپنے دام فریب میں ایسے جکڑ دیتے ہیں کہ وہ چکرا کر رہ جاتا ہے اور کچھ نہیں کر پاتا۔ چالبازوں کی فریبی چالوں سے خدا تعالیٰ ہر کسی کو اپنی پناہ میں رکھے اور فریبیوں کے ہتھکنڈوں سے محفوظ رکھے۔

دھوکا دینا اور فریب کھانا ایسے مرکبات ہیں جو کم وبیش ہر شخص کی فطرت اور جبلّت میں شامل ہیں۔ حاکم محکوم کو اور محکوم حاکم کو، افسر ماتحت کو اور ماتحت افسر کو، مالک مزدور کو اور مزدور مالک کو، شکاری شکار کو اور شکار شکاری کو، آجر اجیر کو اور اجیر آجر کو، چھوٹا بڑے کو اور بڑا چھوٹے کو، دکاندار گاہک کو اور گاہک دکاندار کو، بائع مشتری کو اور مشتری بائع کو، استاد شاگرد کو اور شاگرد استاد کو، غرض سب ایک دوسرے کو جھل دینے کی فکر میں لگے رہتے ہیں اور یوں مکر وفریب کا دھندہ جاری وساری رہتا ہے۔

ٹھگ کی ٹھگی اور مکار کی مکاری کا شمار بھی دھوکا باز کی دھوکا دہی اور فریبی کی فریب کاری میں شمار ہوتی ہے۔ ٹھگ کی ٹھگی کے انداز انوکھے اور نرالے ہوتے ہیں اور مکارانہ طرزِ عمل سے بار بار لومڑی ہی یاد آتی ہے جس کی مکاریاں ضرب المثل ہیں۔

قتل وغارت، لوٹ کھسوٹ اور دھوکا وفریب کی آج کل ہر سو دوہائی مچی ہوئی ہے۔ روزانہ نت نئی وارداتیں سننے اور دیکھنے میں آتی ہیں اور تحقیقات پر ثابت بھی ہو جاتی ہیں مگر افسوس کہ پولیس اور انتظامیہ ان کے تدارک اور سدِّ باب میں بے بس ہو کر رہ جاتی ہے اور قانون تک کو بھی بڑا دھچکا اور دھکا لگتا ہے۔ اس کے انسداد کی بس ایک ہی صورت نظر آتی ہے اور وہ ہے فریب خوردوں کا فریبیوں کے خلاف متحدہ

Marfat.com

محاذ اور ذہنی انقلاب جو مذہبی عقائد اور اخلاقی اقدار کی پابندی و پاسداری پر ہو۔

دورِ حاضر میں مکر وفریب کا جو جال پھیلا ہوا ہے اس میں بیشتر وہ لوگ پھنستے ہیں جو کمزور، بے بس اور غریب ہوتے ہیں۔ کمزور اور غریب ہونا کوئی الزام نہیں۔ کمزوری اور غریبی خوش نصیبی نہ سہی مگر بدنصیبی اور بے غیرتی بھی نہیں۔ ہر چالاک اور ہوشیار شخص انہیں دھوکا دیتا ہے۔ سیاستدان تو بالخصوص ان کو ہمیشہ دھوکے میں رکھتے ہیں۔ یہاں تک کہ ہمارے حکام تک بھی انہیں فریب ہی دیئے جاتے ہیں اور ان کی کمزوری کا بھی ایک زور ہوتا ہے مگر وہ تب چلے گا جب وہ متحد ہو کر اٹھ کھڑے ہوں گے اور ستمگروں کو باور کروادیں گے کہ فریب کھانا اتنا بُرا نہیں مگر دھوکا دینا بہت بُرا ہے۔

فریب اور دھوکا کھانا ایک فطری کمزوری ہے جس کو دور کرنے کے لئے فریب خورانی اور دھوکا خوردنی کی غذا ضروری ہے۔ مزید برآں حیات اِنسانی کا بھی یہی تقاضا اور حکم ہے کہ دھوکے پر دھوکا کھانا اور فریب پر فریب میں آنا ناگزیر ہے اور غریب محتاج اور مجبور لوگوں کو اس کا لقمہ زہر مار کرنا پڑتا ہے جبکہ شریفوں اور سادہ لوحوں کی شرافت اور سادگی ان کا شکار ہونے میں بڑے کام آتی ہے۔ اس بلائے اسیری کے گرفتار تڑپتے، روتے اور آہ وفغان کرتے ہیں مگر ان کی چیخ و پکار اور آہ وزاری کسی کام نہیں آتی اور کوئی ان کی فریاد کو نہیں پہنچتا کیونکہ بقول شاعر ان کا مقدر یہی ہے کہ

فغان کہ مجھ غریب کو حیات کا یہ حکم ہے
سمجھ ہر ایک بات کو مگر فریب کھائے گا

ماقبل سطور میں فریب کی برائی کا جیسا کہ ذکر کیا گیا ہے کہ فریب کھانا اتنا قبیح نہیں جتنا کہ فریب دینا قبیح ہے یعنی قبل الذکر بُرا اور مؤخر الذکر بہت بُرا ہے مگر جب فریب کھانا اور فریب دینا کسی شخصیت میں یکجا ہو جاتے ہیں تو وہ خود فریبی کا شکار ہو جاتا ہے جو فریب کاری کی بدترین صورت ہے۔ یہ اِنسان کی ایسی بھول ہے جو ہمیشہ اسے ناکامیوں سے ہمکنار اور شکست سے دوچار کرتی ہے نکتہ کی بات صرف اتنی ہے کہ فریب خوردگی کا باعث کمزوری اور مجبوری ہے مگر خود فریبی کا انجام ہمیشہ شکستگی اور شکست خوردگی ہوتا ہے اور اہلِ دانش فریب خوردگی اور شکست خوردگی کا فرق بزبان اقبال خوب جانتے ہیں کہ

Marfat.com

وہ فریب خوردہ شاہیں کہ پلا ہو کرگسوں میں
اسے کیا خبر کہ کیا ہے رہ و رسم شہبازی
پرواز تو دونوں کی ہے اسی ایک فضا میں
کرگس کا جہاں اور ہے ، شاہیں کا جہاں اور

بس مختصراً اتنا جان لیجئے کہ دھوکا اور فریب اسی کا نام ہے کہ "کہنا کچھ اور کرنا کچھ" لہٰذا دھوکا دھڑی سے باز رہیئے اور دھوکے کی ٹٹی میں نہ بیٹھیے۔ نہ کسی سے دھوکا کیجئے اور نہ کسی کو دھوکے میں رکھیئے۔ نہ کسی کے فریب میں پھنسیئے اور نہ کسی سے دھوکا کھایئے کیونکہ ان دونوں کے اثرات وثمرات مضر ہیں اور ان کا حاصل حصول صفر کے سوا کچھ نہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ کبھی خود فریبی کا شکار بھی نہ بنیئے۔ اور دانشوروں کی اس بات کو گرہ دے لیجئے کہ "جھوٹ بولنا اور سچ کو چھپانا سراسر فریب اور دھوکا ہے"

Marfat.com

دھونس اور دھاندلی

دھونس اور دھاندلی دونوں مونث ہیں اور مونث ہوتے ہوئے باعثِ وبال وزحمت ہیں۔ دھونس جھانسا، فریب، دباؤ اور دھمکی کے معنی دیتا ہے اور دھاندلی بددیانتی اور حیلہ وحجت سے حقائق کو مسخ کرنے اور صحیح بات کے چھپانے کا مفہوم دیتا ہے۔ دھونس دینے والے کو دھونسیا اور دھاندلی کرنے والے کو دھاندلیا کہتے ہیں۔

دھونس کی بنیاد جور وجبر ہے جو قوت وطاقت کے بل بوتے پر پروان چڑھتی ہے اور دھاندلی کی بنیاد بدنیتی ہے جو خیانت اور بددیانتی کی بدولت ثمر آور ہوتی ہے دھونس سراسر ظلم وزیادتی ہے اور دھاندلی ہیرا پھیری کا دوسرا نام ہے جسے انگریزی میں کرپشن کیا جاتا ہے۔

دھونس اور دھاندلی دونوں حربے کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ دھونس زبردستوں اور زورآوروں کا حربہ ہے اور دھاندلی صاحبانِ اختیار واقتدار کا شیوہ ہے۔

دھونس بنیادی حقوق سے محرومی کا باعث بنتی ہے اور دھاندلی حق وانصاف کا گلا گھونٹتی ہے۔ دھونسیئے اپنی دھونس اور دھڑکے سے دوسروں کو دھونس دے کر یا زور زبردستی سے اپنے ناجائز مقاصد حاصل کرتے ہیں اور دھاندلیئے اپنے دھاندل پنے سے دھاندلی مچاتے ہیں، جھگڑے پھیلاتے ہیں، ٹنٹے کھڑے کرتے ہیں اور مکاری وبے ایمانی سے ناجائز حربے استعمال کر کے مطلب برآری کرتے ہیں۔

چور چوری سے، لٹیرے لوٹ مار سے، ڈاکو ڈاکہ زنی سے، دہشت گرد دہشت گردی سے اور انتہا پسندی سے اپنی دھونس جماتے ہیں۔ دھاندل باز اپنے نوع بنوع طریقوں سے حقائق کو کچھ ایسے انداز سے مسخ کرتے ہیں کہ تلاشِ بسیار کے باوجود ان کے سائے بھی دکھائی نہیں دیتے۔ اصل معدوم ہو جاتے ہیں۔ کرپٹ اہلکار دستاویزات میں ہیرا پھیری اور فنڈز کو بالخصوص خورد برد کرنے میں اپنی استادانہ فنکاری سے دھاندلی کے ماہر ہوتے ہیں اور ان کے شاہکار کارناموں پر حیرت ہوتی ہے۔ اور صاحبانِ اقتدار الیکشن کے نتائج کچھ اس طور مرتب

Marfat.com

کرتے ہیں کہ دھاندلی کے نشانات تک باقی نہیں چھوڑتے اور اگر کوئی دھاندلی کی نشاندہی کے لئے آواز اٹھاتا ہے تو وہ آواز اس صفائی سے دبادی جاتی ہے کہ نہ دھونس کا پتہ چلتا ہے اور نہ دھاندلی ہی ثابت ہو پاتی ہے۔ یہ دھاندلی کچھ ایسی ہوشیاری، چالاکی اور رازداری سے کی جاتی ہے کہ اصلیّت کے نقوش کا نام ونشان تک مٹ جاتا ہے۔

دھونس اور دھاندلی کے مذکور فرق کے باوجود ان کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔اس امر سے بھی انکار ممکن نہیں کہ یہ باہم لازم وملزوم ہیں۔ یہ ساتھ ساتھ چلتی ہیں ان کا اشتراک عمل سونے پر سہاگے کا کام کرتا ہے۔ دھونس دھاندلی کے بغیر اور دھاندلی دھونس کے بغیر ادھوری اور نامکمل متصوّر ہوتی ہے۔ دھونس جمانے والوں کا عمل دھاندلی سے ماورا نہیں ہوتا اور دھاندلی کی کارروائی میں بھی دھونس کا عنصر ہی غالب ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دھونس اور دھاندلی کا استعمال اکھٹا بھی کیا جاتا ہے عین اسی طرح جس طرح کہ ہم ظلم اور ستم کا ایک ساتھ استعمال کرتے ہیں۔ ستم اگر ظلم سے برتر یا ظلم اگر ستم سے برتر سمجھا جاتا ہے تو دھاندلی دھونس سے بڑی یا دھونس دھاندلی سے بڑی متصوّر کی جاسکتی ہے۔اور جو احباب ان دونوں مرکبات کو مترادف قرار دیتے ہیں وہ بھی حق بجانب ہیں۔

"ایک کریلا دوسرا نیم چڑھا" اُردو کی مشہور ضرب المثل ہے۔اس کے مفہوم کو اگر میں یوں بیان کروں کہ "ایک دھونسیا دوسرا دھاندلیا" یا "ایک دھاندلیا دوسرا دھونسیا" تو آپ کا کیا خیال ہے؟ یقین ہے کہ آپ اتفاق ہی کریں گے اور میری اس دعا پر امین بھی کہیں گے کہ خداوندِ رحیم و کریم ہمیں دھونس اور دھاندلی کے ارتکاب سے بچنے کی توفیق عطا فرمائے اور ہم سب کو دھونسیوں اور دھاندل بازوں کے شر اور زیادتیوں سے محفوظ رکھے۔

Marfat.com

دید اور شنید / دیدہ اور شنیدہ

یہ الفاظ فارسی مصادر دیدن اور شنیدن سے مشق ہیں۔ دیدن دیکھنا اور شنیدن سننا کے معنوں میں مستعمل ہے۔ دیدہ چشم کا متبادل ہونے کے ساتھ ساتھ شوخی اور دلیری کے معنی بھی دیتا ہے اور بطور صفت مفعولی (دیکھا ہوا) بھی مستعمل ہے اور شنیدہ بطور صفت مفعولی (سنا ہوا) استعمال ہوتا ہے جیسے کہ فارسی کا مقولہ ہے کہ ''شنیدہ کے بود مانندِ دیدہ'' یعنی سنی سنائی بات آنکھوں دیکھی بات کے مقابلے میں ہیچ ہے۔ فارسی کا دیدہ بمعنی آنکھ اُردو میں دیدے کی صورت میں بطورِ واحد اور جمع استعمال کیا جاتا ہے۔

فارسی سے جو دید شنید (واقفیت) رکھتے ہیں ان کی دید و شنید (دیکھنا سننا) اُردو دانوں سے زیادہ خالص ہوتی ہے کیونکہ اُردو والے فارسی الفاظ سے اپنے الفاظ لگا کر طرح طرح کے مطالب بنا لیتے ہیں۔

"دید باز" محض دیکھنے والا ہوتا ہے مگر "دیدہ باز" تاک جھانک کرنے والا ہوتا ہے جسے ہر کوئی اخلاق باختہ کہتا ہے اور وہ جن کا "دیدہ بڑا ہوتا ہے" (ڈھیٹ / شوخ) لوگ انہیں "دیدہ دلیر" (بے شرم، بے غیرت، گستاخ) کہتے ہیں مگر جب وہ کسی بہادر کو "دیدہ دلیر" کہتے ہیں تو ان سے ان کی مراد بہادر کا نڈر اور بے باک ہونا ہوتا ہے۔

"دید خواہ / دیدہ براہ" (طالب ملاقات) اپنوں کا چشمِ براہ (منتظر) ہوتا ہے اور ان کی آمد پر "دیدہ و دل فرشِ راہ کرتا ہے" (تواضع کرنا) مگر جس سے "دید و شنید" نہ ہو اس سے راہ و رسم بڑھانا "دیدہ وری" (دانائی) نہیں جبکہ "دیدہ ور" تو صدیوں بعد اور سینکڑوں میں سے ایک بڑی مشکل سے پیدا ہوتا ہے بقول شاعر:

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں "دیدہ ور" پیدا

فارسی والے دوسروں کی عیب جوئی کو گناہ سمجھتے ہیں اور گناہوں سے چشم پوشی کو نیکی خیال

Marfat.com

کرتے ہوئے بجا کہتے ہیں کہ "ازعیب وگناہِ کسے "دیدہ دوختن" کارِ نیکواست" مگر اُردو والے بے مرّوتوں کی طوطا چشمی کو "دیدہ سفید کرنا" اور دل کے عشق کرنے کو "دیدہ سرخ کرنا" سے تعبیر کرتے ہیں۔ بصارت سے محرومی کو "دیدہ بہ جانا" یا "دیدہ بیٹھ جانا" سے ظاہر کرتے ہیں اور چوکیدار کو آنکھیں کھلی رکھنے اور کان کھڑے رکھنے پر "دیدہ دار" کہتے ہیں اور یوں اپنی علمیت کے زعم میں "دیدہ بینا" رکھنے اور "دیدہ دار" ہونے کا ثبوت فراہم کرنے کی سعی کرتے ہیں مگر ہم جانتے ہیں کہ معمولی معمولی باتوں پر وہ دیدے نکالنے اور بات بات پر "دیدہ دکھانے" کے عادی ہوتے ہیں اور بہت جلد اپنے "دیدے نیلے پیلے کر کے "ایک دوسرے سے دست وگریبان ہوجاتے ہیں۔ وہ مطلب کے وقت اپنے "دیدے دوسروں کے تلوؤں سے ملتے ہیں" مگر مطلب نکل جانے پر ان کے "دیدے بدل جاتے "ہیں اور مصائب کے وقت ان کے دیدے" بھر بھی آتے ہیں "اور "بہہ بھی نکلتے "ہیں۔ جب وہ راہ چلتی عورت پر "دیدے پھاڑ پھاڑ" کر نگاہِ غلط ڈالتے ہیں تو انہیں "دیدے پھوٹنے" کی نسوانی بددعا کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور ان کے مقابلے میں جب عورت کے "دیدے کا پانی ڈھل جاتا" ہے تو وہ "دیدے چمکاتی/ مٹکاتی "مردوں کو خود دعوتِ نظارہ دیتی ہے۔ حیرت میں ان کے "دیدے پتھر ہوجاتے "ہیں اور حالات وواقعات کی سنگینی میں ان کے "دیدے میں ترمرے پھرنے لگتے "ہیں اور "سرسوں پھولنے لگتی" ہے مگر پھر بھی ان کے "دیدے نہیں کھلتے"۔ اور وہ جن کے "دیدے میں شرم وحیا" نہیں ہوتی ان کے "دیدے پھٹے ہوتے "ہیں یعنی انہیں نہ کسی کا لحاظ ہوتا ہے اور نہ کوئی ان کی نظروں میں سماتی ہے مگر ان کا انجام ملاحظہ ہو کہ نزع کے وقت جب ان کے "دیدے الٹ جاتے "ہیں اور " کھلے کے کھلے رہ جاتے "ہیں ان کا "پانی مرجاتا" ہے۔ وہ "پتھرا جاتے "ہیں تو ان کے دیدے اپنے انجام کو پہنچ جاتے ہیں۔

دید اور شنید کی اس دیدہ خوری اور دیدہ اور دیدے کی اس فارسی اُردو کے مبحث کے بعد میں تو یہی نتیجہ اخذ کرتا ہوں کہ شنید کو خیر باد کہنا چاہیئے اور دید پر اعتبار کرنا چاہیئے۔ کوئی قدم اٹھانے یا کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے ہر امر کو چشم بینا سے دیکھنا اور دیدۂ دل سے پرکھ لینا چاہیئے۔

Marfat.com

ڈاراورڈر

ڈاراورڈر میں بظاہر تو کوئی مشابہت ومطابقت نہیں ہے مگر ان دونوں میں الف کا جوفرق ہے اس کی کمی بیشی ایک دوسرے کو آپس میں بدل دیتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ جس سے عنوان کا انتخاب کیا گیا ہے۔

ڈار کے معنی قطار کے ہیں بالخصوص جانوروں اور پرندوں کی قطار یا جھنڈ۔ ہندی میں اس کا متبادل لفظ "پَرا" ہے جو غول، گروہ اور صف کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ فوج کی صف یا قطار کو بھی پَرا ہی کہتے ہیں جیسے کبوتر، کونجیں، مرغابیاں، ابابیلیں اور شہد کی مکھیاں ڈار (قطار) کی شکل میں اڑتی ہیں۔ اونٹ اپنی کمر پر بوجھ اٹھائے اپنی نکیلیں ایک دوسرے کی دُموں سے باندھ کر آگے پیچھے قطار بنائے عازم سفر ہوتے ہیں۔ ہرن بھی قطاریں باندھ کر چلتے اور دوڑتے ہیں۔ پریاں بھی قطار اندر قطار کھڑی ہوتی ہیں اور محوِ پرواز رہتی ہیں۔ فوج بھی صف بندی کر کے صف آرا ہوتی ہے اور نمازی بھی صفیں باندھ کر نماز ادا کرتے ہیں شب تار میں آسمان پر ستاروں کے جھرمٹ قطار در قطار جھلملاتے اور چمکتے دمکتے دکھائی دیتے ہیں۔ لمبی چوڑی لہریں بھی جس قرینے سے اٹھتی، ابھرتی اور چلتی ہیں ان کی قطاروں بھری رفتار میں بھی قطار بندی کا حسین منظر دکھائی دیتا ہے لیکن بعض جاندار ایسے بھی ہیں جو قطاروں میں چلنا کسرِ شان سمجھتے ہیں جیسے بٹینس اور گدھے مگر گھوڑوں کا ساتھ ساتھ چلنا اس امر کی غمازی ہے کہ وہ ساتھیوں سے سبقت لے جانے کی دھن میں ہوتے ہیں لیکن سب سے عجیب بات جو دیکھنے میں آئی ہے وہ عورتوں اور لڑکیوں کا باہم مل کر چلنا ہے۔ وہ آگے پیچھے (قطار میں) ہرگز نہیں چلتیں بلکہ ایک دوسری سے دائیں بائیں جڑ کر گائیں بھینسوں اور بھیڑوں بکریوں کی طرح ایسے بے ہنگم طریقے سے چلتی ہیں کہ جس سے ٹریفک جام ہو کر رہ جاتی ہے۔ ایسے لگتا ہے جیسے وہ کسی انجانے ڈر کے مارے مجبوراً یا ارادۃً یوں چلتی ہیں۔

اب رہا سوال ڈر کے ذکر کا تو جنابِ من! ڈر جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ خوف، اندیشہ یا خطرہ کا مفہوم دیتا ہے لیکن یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ ڈر کا تعلق صرف احساس اور سوچ سے ہے

Marfat.com

بذاتہٖ اس کی نہ کوئی اصلیّت ہے اور نہ حقیقت۔

بعض دانشور ڈر کو فطری قرار دیتے ہیں اور بعض واقعاتی۔ اگر اسے فطری سمجھا جائے تو یہ کمزوری ہے جو دیرپا اور مستقل ہے اور اگر اسے واقعاتی سمجھا جائے تو یہ عارضی اور غیر مستقل ہے مگر میں سمجھتا ہوں کہ ڈر دونوں صورتوں میں ڈر ہی ہے اور بداثر ہے۔ یہ دل و دماغ کو بُری طرح متاثر کرتا ہے۔ اس سے ہمیشہ ڈرنا اور بچنا ہی چاہیئے۔

ڈر کئی قسموں کا ہوتا ہے مثلاً وصل میں ہجر کا ڈر۔ حرکاتِ قبیحہ پر بڑوں کی باز پرس کا ڈر۔ جرائم سے گرفتاری اور سزا کا ڈر۔ کسی وجہ سے روزی رزق چھن جانے کا ڈر۔ سچی بات کہنے سے زبان بندی کا ڈر۔ دورانِ سفر حادثات کا ڈر۔ دولت یا اقتدار چھن جانے کا ڈر۔ عزت یا مال لٹ جانے کا ڈر۔ وردی اترنے کا ڈر۔ احتجاج پر قانون شکن اور باغی قرار دیئے جانے کا ڈر۔ لیکن دو طرح کے ڈر سب سے خطرناک قرار دیئے جاتے ہیں۔ ایک موت کا ڈر دوسرے جان (جانے یا بچانے) کا ڈر۔ غرض ہر شعبہ حیات میں طرح طرح کے ڈر اِنسان کو درپیش ہوتے ہین جو اسے ڈراتے دھمکاتے ہیں اور خوف زدہ کرتے ہیں اور فرد کی شخصیّت پر منفی اثرات مرتب کرتے ہیں۔ اس کی فکر اور اس کے عمل میں تبدیلی کا باعث بنتے ہیں۔ اس کی صلاحیتیں اجاگر ہونے کے بجائے سلب ہو کر رہ جاتی ہیں۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ ڈر جانے بھی ہوتے ہیں اور انجانے بھی ہوتے ہیں یہاں تک کہ اِنسان خواب میں بھی ڈر جاتا ہے اور خوف کے مارے بڑبڑا کر اٹھ جاتا ہے اور گھنٹوں اس ڈر سے متوحش رہتا ہے۔ بالآخر اس ڈر کو خواب و خیال اور وہمہ سمجھ کر اس سے چھٹکارا پاتا ہے مگر ماہرینِ نفسیات اس کی گونا گوں توضیحات سے اس ڈر کو دور کرنے کے بجائے اس میں اور اضافہ کر دیتے ہیں اور معبّر حضرات بھی نوع بنوع تعویلات و تعبیرات سے فرد کو شک و شبہ اور غیر متوقع خطرات میں ڈال کر پریشان کر دیتے ہیں۔

مختصراً یہ کہ ہر جاندار کو شعوری یا لاشعوری طور پر ڈر لاحق رہتا ہے یا یوں سمجھیئے کہ ڈر ہر جاندار کو ڈراتا ہے جس سے وہ خوف کھا کر خود حفاظتی کے لئے مختلف حربے کام میں لاتا ہے۔ مثلاً بچے ڈر کے مارے سہم جاتے ہیں عورتیں چیخنے لگ جاتی ہیں۔ پرندے پھڑ سے اڑ جاتے ہیں۔ چور بھاگ جاتے ہیں یا زیرِ زمین چلے جاتے ہیں۔ چوہے بل میں گھس جاتے

Marfat.com

ہیں۔کبوتر آنکھیں موند لیتے ہیں۔طالب علم استاد کی مار سے ڈر کر کام کرتے ہیں مگر نڈر ڈر سے خائف نہیں ہوتے۔نادار اور مفلس بھوکوں مرنے کے ڈر سے خودکشی کر لیتے ہیں۔عاشق ہجر کی تاب نہ لاتے ہوئے اپنا سر پھوڑ لیتے ہیں یا وصال کی آرزو میں دریا کی لہروں کی نذر ہو جاتے ہیں۔مگر یاد رہے کہ ماہرین نفسیات کا کہنا بالکل بجا ہے کہ بچوں کو خوفناک چیزوں کا نام لے کر ہرگز نہیں ڈرانا چاہیئے۔اس سے انجانے خوف ان کے لاشعور میں بیٹھ جاتے ہیں جس سے ان کی شخصیت کی نشوونما رک جاتی ہے۔

ڈار اور ڈر کے ذکرِ بالا سے میں تو صرف یہی سمجھ پایا ہوں کہ ڈار (قطار۔قطار بندی) وابستگی اور ڈسپلن کی علامت ہے اور ڈر بے حقیقت شئے ہے اور کسی چیز سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے تاہم اگر ڈرنا ہی ہے تو صرف خدا سے ڈرنا چاہیئے جس سے ہماری دنیاوی اور اخروی زندگی کے سنورنے کا راز مضمر ہے۔

Marfat.com

ڈر اور ڈراما

ڈر اُردو کا لفظ ہے جو خوف، اندیشہ اور خطرہ کا مفہوم ادا کرتا ہے اور ڈراما انگریزی میں سوانگ، نقل اور تمثیل کے معنی دیتا ہے اُردو میں اسے ڈھونگ کا نام بھی دیا جاتا ہے جو عام طور پر دکھاوا، تماشا اور فریب وریا کاری کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

مختصر اُڈر خوف ہے جو ایک بار لگ جائے اور دل ودماغ میں بیٹھ جائے تو مشکل سے نکلتا اور ٹوٹتا ہے_____ اور ڈراما کھیل ہے_____ دکھاوے کا کھیل یا ایک ڈھونگ ہوتا ہے_____ خودساختہ ڈھونگ_____ جو باندھا، دکھایا یا رچایا جاتا ہے اور ڈھونگی اس کا اسم فاعل ہے جو مکار اور فریبی کے لئے بولا جاتا ہے۔

ڈر ان دیکھا اور انجانا ہوتا ہے جبکہ ڈراما دیکھا بھالا اور جانا پہچانا ہوتا ہے۔ ڈر منجمد ہوتا ہے اور ڈراما متحرک ہوتا ہے۔ ان میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ ڈر دل میں گھر کر لیتا ہے اور ڈراما آنکھوں میں سما جاتا ہے۔

ڈر صرف محسوس کیا جاتا اور ڈراما بنایا جاتا ہے۔ لکھا جاتا ہے۔ کھیلا جاتا ہے۔ دیکھا جاتا ہے۔ دکھایا جاتا ہے یا پھر رچایا جاتا ہے۔ ڈر کی ہر صورت کربناک، خوفناک اور ڈراؤنی ہوتی ہے لیکن ڈراما کی جو بھی صورت ہو پڑھنے دیکھنے والوں کو متاثر ضرور کرتی ہے چاہے یہ تاثر ڈر کا ہو یا خوشی کا۔ سوچ کا ہو یا فکر کا۔ قابلِ قبول ہو یا ناقابلِ قبول۔ پسند آئے یا نہ پسند ہو۔ حقیقی ہو یا اصلی، نقلی ہو یا بناوٹی۔ حیات یا معاشرے کے کسی پہلو کا عکاس ہو یا تنقید وطنز کا مظہر ہو غرض کیسا بھی ہو ڈراما ہی ہوتا ہے لیکن اس کے بنانے اور رچانے کا کوئی نہ کوئی مقصد ضرور ہوتا ہے جو پوشیدہ ہوتا ہے۔ صاحبِ ڈراما کے اس خفیہ مقصد کا اظہار دیکھنے والوں کو دعوتِ فکر دیتا ہے اور یوں ناظر کبھی تو اس کے مقصد کو جان کر تسلیم کر لیتا ہے اور کبھی محض ڈراما سمجھ کر درخورِ اعتنا نہیں سمجھتا اور یا کبھی اس کے انجام کو بھانپ کر گھبرا جاتا ہے یا زہرخند سے اڑا دیتا ہے یا اگر اس کے دل کو بھائے تو متبسم ہو کر مسرت کا اظہار کرتا ہے اور اگر وہ حُزن فزا یا وحشت افزا ہو تو محزون ومتوحش ہو جاتا ہے۔

Marfat.com

کہتے ہیں کہ رہس دھاریئے، نقال، بھانڈ اور مراسی بڑے ڈراما باز ہوتے ہیں جونت نئے نئے روپ دھار کر اور خود ڈراما بن کر ڈراما کے فن کو حیاتِ نو عطا کرتے ہیں مگر میں سمجھتا ہوں کہ ڈراما نویس ان سب کا استاد ہے جو بات بات سے بڑے بڑے ڈرامے گھڑ لیتا ہے مگر خود ڈراما نہیں بنتا لیکن بڑی چابکدستی سے ڈراما کے پسِ پردہ رہتا ہے۔

ڈراما سے شوق و عشق رکھنے والے طالبان کالیداس اور شیکسپیئر کو ڈراما کے پیشوا بلکہ باپ دادا سمجھ کر اپنی عقیدت کا اظہار کرتے ہیں لیکن اہلِ ادب کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے اسے ایک الگ اور باقاعدہ صنف قرار دے کر اس کے پانچ اہم مراحل/ مدارج قائم کر رکھے ہیں۔ان کا کہنا ہے کہ یہ آغاز سے چل کر عروج کو پہنچتا ہے اور پھر زوال پذیر ہوتے ہوئے اپنے منطقی انجام کو پہنچتا ہے جبکہ مکالمہ اور سٹیج اس کے اہم لوازمات ہیں جن کے بغیر نہ تو ڈراما کا تصور پیدا ہوتا ہے اور نہ اس کا تشخص قائم رہتا ہے اور یہ حقیقت شیکسپیئر کے بقول یوں واضح ہوتی ہے کہ

"Life is a stage and every man plays his part"

یعنی زندگی ایک ڈراما ہے جس کی سٹیج پر ہر شخص اپنا کردار ادا/ پیش کرتا ہے۔

یاد رہے کہ فلم ڈراما کی ترقی یافتہ اور آخری شکل ہے جو اپنے جوبن بھرے روپ میں دکھائی دیتی ہے۔

رہا ڈر کا باقی ذکر تو ڈر حزن و ملال کا باعث بنتا ہے۔گھبراہٹ اور اضطراب کو جنم دیتا ہے۔ وہ ہمیں مخوف متوحش کرتا ہے۔اس سے مایوسی اور ناامیدی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔وہ ہمیں پست ہمت اور کم حوصلہ بنا دیتا ہے لہٰذا عافیت اسی میں ہے کہ ہم ڈر سے دور ہی رہیں اور اسے اپنے نزدیک تک نہ پھٹکنے دیں۔اگرچہ دانا کہتے ہیں کہ ڈر سے ڈرنا نہیں چاہیئے اسی لئے تو یہ ضرب المثل بنی ہے کہ ''جو ڈرا سو مرا'' مگر میں تو اسے ہی حقیقت سمجھتا ہوں کہ ڈر سے ڈرتے ہی رہنے میں عقلمندی ہے۔اسی میں بھلائی اور بہتری ہے۔اور

یہ بھی یاد رہے کہ نہ ڈرنا اچھا ہے اور نہ ڈرانا کیونکہ ڈرنا کمزوری اور بے بسی کی دلیل ہے مگر ڈرانا ڈرامے کی طرح ایک فن ہے جس کے ماہرین میں رہزنوں اور دہشت گردوں کا نام سرفہرست ہے مگر پولیس والے بھی کسی سے کم نہیں ان کے فنکارانہ جربے ڈراموں سے کم نہیں ہوتے۔حکمران اور افسران اپنے اختیارات کے منفی اثرات کی دھمکی دے کر اپنا اُلو سیدھا

Marfat.com

کرنے میں یدِ طولیٰ رکھتے ہیں مگر ان والدین کے اس طرزِ عمل پر حیرت ہوتی ہے جو یہ نہیں جانتے کہ وہ بلّی کتے یا جن بھوت وغیرہ کے نام سے اپنے بچوں کو ڈرا کر ان کی شخصیت کی نشوونما اور سیرت سازی میں کتنی بڑی رکاوٹ کا سبب بنتے ہیں کیونکہ ماہرین نفسیات کے بقول ڈر بڑی خطرناک شئے ہے اور یہ محض ایک واہمہ ہے۔

ڈر سے کام لیا بھی جاتا ہے، دیا بھی جاتا ہے اور نکالا بھی جاتا ہے۔ اگرچہ اس طرح کام ہو بھی جاتا ہے اور بن بھی جاتا ہے لیکن ایسے کام کا فائدہ جو مجبوری کے عالم میں بددلی سے انجام پائے کیونکہ کام وہی بہتر اور مفید ہے جو شوق اور خوش دلی سے کیا جائے اور فرض سمجھ کر کیا جائے۔

بچہ ڈر سے سہم کر کام کرتا ہے۔ ملازم اور خادم اپنے افسر اور مالک کے خوف سے کام میں جتے رہتے ہیں۔ ملزم پولیس کی مار سے ڈرتا ہے۔ مجرم عدالت کے فیصلے سے خوف زدہ رہتا ہے۔ مظلوم ظالم کے ظلم سے کانپتا ہے۔ بیوی شوہر کی پابندیوں اور سختیوں سے گھبراتی اور شوہر حضرات بیگمات کی فرمائشوں اور دھمکیوں سے مرعوب ہو کر اور ان کے "روسے" کی اداؤں سے خوفزدہ ہو کر اس حد تک ڈر جاتے ہیں کہ خون مرید بن کر رہ جاتے ہیں۔ غرض ہر کوئی ڈر اور خوف کے مارے کام کرتا ہے مگر افسوس کہ جس ذات (خدا) سے ڈرنا چاہیئے ہم یہ جانتے ہوئے بھی نہیں ڈرتے کہ اس کی پکڑ بڑی سخت ہے۔

جہاں تک ڈرامے کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں میرا مشورہ یہی ہے کہ ڈرامے ضرور پڑھیں اور فرصت ملے تو بے شک شوق سے دیکھیں مگر ڈرامے بنانے اور رچانے سے ہر چند گریز کریں تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ خود ہی ڈراما بن کر رہ جائیں۔

مختصر یہ کہ نہ ڈر کو ڈراما بنائیں اور نہ اسے ڈراما سمجھیں اور نہ ڈراما کو بھیانک اور ڈراؤنا بنائیں بلکہ ڈر میں ہمت اور حوصلہ سے کام لیں اور ڈراما میں نیکی اور نصیحت کا دامن تھامے رکھیں۔

انہی مشاورتی الفاظ سے ڈر اور ڈراما کا ذکر کافی مقصود کرتے ہوئے "خدا حافظ" کے دعائیہ کلمات سے اجازت کا خواستگار ہوں۔

Marfat.com

ڈیل اور ڈھیل

ڈیل(Deal) انگریزی کا لفظ ہے جو بطور اسم اور فعل استعمال ہوتا ہے اور ڈھیل اُردو کا لفظ ہے جو صرف بطور اسم مونث استعمال ہوتا ہے۔

ڈیل کے معنی لین دین، بنج بیوپار، سلوک برتاؤ اور بانٹ تقسیم کے ہیں۔ ڈیلر(Dealer) اس کا اسم فاعل ہے مگر ڈبل ڈیلر(Double Dealer) ریاکار (دوبھیسیا) کو کہتے ہیں۔

ڈھیل کے معنی سستی / کاہلی۔ مہلت / فرصت۔ وقفہ / تامّل۔ لاپروائی / بے توجہی اور جھول کے ہیں جو "دینا" اور "کرنا" کے افعال کے ساتھ استعمال ہوتا ہے۔ ڈھیلا اسم صفت ہے مگر ڈھیلا (بہ یائے مجہول) ڈلا، مٹی کا ٹکڑا (کلوخ) اور اندرونی حصہ چشم کے معنی رکھتا ہے۔

ڈیل کئی قسموں کی ہوتی ہے مثلاً معاشی، معاشرتی، علمی، ادبی، سیاسی، کاروباری اور ٹھیکیداری وغیرہ۔ یہ دو افراد یا دو پارٹیوں کے درمیان ہوتی ہے اس میں تیسرے کو کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ البتہ یہ اور بات ہے کہ یہ تیسرے کی بدولت عمل میں آتی ہے۔ یہ نظریۂ ضرورت کے تحت طرفین کے مفادات کے حصول کے لئے تشکیل پزیر ہوتی ہے۔ اسے سیاسی حکمتِ عملی کا شاہکار تصوّر کیا جاتا ہے جس میں "کچھ لو، کچھ دو" کا فلسفہ کارفرما ہوتا ہے۔ اس میں مفادات کا ٹکراؤ نہیں ہوتا اور نہ اس میں کسی کا کوئی نقصان ہوتا ہے بلکہ فائدہ ہی فائدہ ہوتا ہے۔ البتہ سازش، دباؤ یا غلط فہمی کی بنا پر کی گئی ڈیل(Mis Deal) ہوتی ہے جس کے ہمیشہ منفی نتائج ہی برآمد ہوتے ہیں۔

لوگ عموماً ڈیل کو سودی بازی کا نام دیتے ہیں اور سودے بازی کو دھوکا دہی کے مترادف خیال کیا جاتا ہے مگر ایسا ہرگز نہیں ہے بلکہ اس کے ذریعے سے تو مصالحت اور مفاہمت کی راہ تلاش کر کے سمجھوتہ طے پاتا ہے۔ ڈیل ہمیشہ مذاکرات اور گفت وشنید کے ذریعے ہمیشہ سمجھوتے پر منتج ہوتی ہے اور بقول چرچل:

> "ڈر کی وجہ سے گفت وشنید مت کرو لیکن گفت وشنید سے بھی مت ڈرو، ڈیل کرنے کا بنیادی اصول ہے جو باہمی مفاہمت اور سمجھوتے کی راہیں کھولتا ہے۔"

Marfat.com

ڈیل پوشیدہ بھی ہوتی ہے اور برملا بھی۔ مفاہمت اور تصفیہ کے لئے جو ڈیل کی جاتی ہے وہ برملا ہوتی ہے مگر سیاسی ڈیل پُر اسرار اور خفیہ ہوتی ہے۔ اس میں انفرادی سیاسی مقاصد پنہاں ہوتے ہیں جو ذاتی مفادات سے عبارت ہوتے ہیں اور ایسی ڈیل کو ملک وملت کے لئے کسی نوع بھی مناسب وموزوں نہیں گردانا جاسکتا۔ یہ ڈیل سیاسی قیادتوں یا قیادتوں اور حکمرانوں کے مابین ہوتی ہے۔ اسے حکمرانوں کی طرف سے ''دانہ ڈالنے'' یا ''ہڈی ڈالنے'' کی ڈیل سمجھا جاتا ہے جس سے تھوڑی بہت ڈھیل دے کر وہ اپنے اقتدار کے تحفظ وتوسیع کے اسباب فراہم کرنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ وہ سیاسی قیادتوں کی حمایت حاصل کرسکیں۔ ایسی ڈیل کو بین الاقوامی سطح پر بھی توسیع دی جاسکتی ہے۔ میرے خیال میں ایسی ڈیل ضرور ہونی چاہیئے جو سیاسی مقاصد سے ماورا ثقافتی، تعلیمی، صنعتی اور تجارتی مقاصد تک محدود ہوتا کہ اقوام کے عوام کی ترقی وخوشحالی کو فروغ مل سکے۔

جہاں تک ڈھیل کا تعلق ہے تو یہ سنّتِ ربانی ہے۔ اِسلامی تاریخ شاہد ہے کہ سرکشوں، باغیوں اور لادین وبے دین اقوام وافراد کو ڈھیل دینے کی روایت موجود ہے جس کے پسِ منظر میں اصلاحی مقصد کارفرما نظر آتا ہے۔ بداَفعال اور بے راہرو ملّتوں کو بھی خالقِ حقیقی نے ڈھیل پر ڈھیل دی تاکہ وہ مائل بہ اصلاح ہوجائیں مگر انہوں نے حکمتِ الٰہی سے مستفید ومستفیض ہونے کے بجائے اپنی کوتاہ اندیشی اور ہٹ دھرمی کو نہ چھوڑا تو خدائے قادر مطلق نے ان کی ڈور کو کھینچ کر انہیں اپنے انعام واکرام سے محروم کرکے اور اپنے دستِ قدرت میں گرفتار کرکے تباہ وبرباد کردیا۔ اکثر قہرِ الٰہی کی زد میں آکر ملیامیٹ ہوگئیں اور کچھ کو اپنے عذاب کے شکنجے میں کس کر عبرت کا نشان بنادیا۔

بلاشبہ ہم اپنے معاشرے کی فوز وفلاح اور افرادِ معاشرہ کی انفرادی اور اجتماعی اصلاح وتادیب کی خاطر دینی، اخلاقی اور قانونی لحاظ سے سنّتِ ربانی کے پیروکار ہیں لیکن اکثر دیکھنے میں یہی آیا ہے کہ اولاد، طلبہ، نوکروں، خادموں، ملازموں، ماتحتوں، ملزموں اور مجرموں کو ڈھیل دینے سے منفی نتائج ہی نکلتے ہیں لہٰذا انہیں ڈھیل نہ دینا ہی بہتر ہے۔

Marfat.com

راج اور رواج

راج حکومت اور رواج ریت (رسم) کو کہتے ہیں راج قائم کیا جاتا ہے اور رواج کو ترویج دی جاتی ہے۔ راج جنگ وجدل، کشت، خون ماردھاڑ اور عسکری وسیاسی قوت کے بل بوتے پر حاصل ہوتا ہے اور قائم رہتا ہے مگر بمصداق ''ہر کمالے راز وال'' اس کا انجام زوال پذیری ہوتا ہے۔ رواج دیکھا دیکھی اور دوسروں کی نقل سے شروع ہوتا ہے اور آہستہ آہستہ معاشرہ میں سرایت کر کے اپنا راج قائم کر لیتا ہے اور معاشرہ کو اپنی گرفت میں جکڑ کر ایسا بے بس کر دیتا ہے کہ معاشرہ اس کے زیر نگیں آجاتا ہے اس کا انجام تغیر ہوتا ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ اس میں رد و بدل ہوتا رہتا ہے۔

راج ہندی الاصل ہے۔ راج کرنے والے کو راجا (راجہ) کہتے ہیں۔ اسکا خاندان راج ہنس[1] کہلاتا ہے اور اس کی رعیت پرجا کہلاتی ہے۔ اس کی بیوی راج پتنی، بیٹا راج کمار اور بیٹی راج کماری کہلاتی ہے۔ اس کا محل راج استھان، پایۂ تخت راج دھانی، خزانہ راج بھنڈار، عدالت (دربار) راج سبھا اور غسل خانہ راج گھاٹ کہلاتا ہے۔ اسکی سلطنت میں رائج مذہب راج دھرم اور عائد ٹیکس راج ڈنڈ کہلاتا ہے۔ راجا کا تخت راج گدی کہلاتا ہے، اس کا آئین (دستور) راج نیتی، وزیر اعظم راج منتری اور درباری شاعر راج کوی کہلاتا ہے راجا کی ضد بال ہٹ اور تریا ہٹ سے بڑھ کر ہوتی ہے جسے راج ہٹ کہا جاتا ہے اور راجاؤں کا راجا مہاراجا کہلاتا ہے۔

راجوں مہاراجوں کا دور اگرچہ ختم ہو چکا ہے مگر راجا اندر اور مہاراجا رنجیت سنگھ نے جو شہرت پائی وہ کسی اور کو نصیب نہیں ہوئی۔ راجا اندر کا اکھاڑا اور مہاراجا رنجیت سنگھ کی سکھا شاہیاں شہرت دوام کی حامل ہیں _____ یہ اور بات ہے کہ الیکٹرانک میڈیا اپنی اخلاق سوز نشریات کے اندرا کھاڑے کا سماں پیش کرتا ہے اور پولیس و واپڈا کی سکھا شاہیاں ہمارے لئے کلفت واذیت کا سامان مہیا کرتی ہیں۔

---

[1] راج ہنس (اردو ہنس راج) ایک آبی پرندہ کو کہتے ہیں (بڑی بطخ، مگھ) ترکی میں اسے قاز کہتے ہیں۔

Marfat.com

راجا کی نسبت سے بہت سی کہاوتیں آج بھی زبان زد عام ہیں جیسے: راجا راج پرجا سُکھی (اچھے حاکم کی رعیت خوش ہوتی ہے) راجا روٹھے گا اپنی نگری سنبھالے گا (راجا (آقا) جس سے ناراض ہو جائے اُسے ملک بدر کر دیتا ہے) راجہ کے گھر آئی رانی کہلائی (غریب عورت اگر راجا (امیر) کی بیوی بن جائے تو رانی کہلاتی ہے) راجہ کے گھر موتیوں کا کال نہیں ہوتا (بادشاہوں اور امیروں کے ہاں کسی چیز کی کمی نہیں ہوتی)۔

راج کے ہندی میں دوسرے معنی مکان بنانے والا (معمار) کے ہیں جس کا پیشہ راج گری/ گیری ہوتا ہے مگر گوہ پہ بیٹھا وہ کسے راجا سے کم نہیں ہوتا۔ طب کی اصطلاح میں راج پھوڑا (مغلی پھوڑا) اور راج روگ (تپدق) مہلک امراض ہیں جبکہ مرغابی (بڑی بسط) راج ہنس کہلاتی ہے۔ پنجابی میں راجہ حجام (نائی) کو کہتے ہیں جس کے گھر استروں کا کال نہیں ہوتا مگر اسے بندوں میں کم ہی شمار کیا جاتا ہے جیسے کہ پنجابی کی مثل ہے کہ "بندہ ایں کہ نائی"

رواج دراصل ایسے طور اطوار ہیں جنہیں معاشرہ اپنے اندر جاری کر لیتا ہے اسے ہم دستورِ معاشرہ یا معاشرہ کا چلن کہہ سکتے ہیں جس سے مفر ممکن نہیں۔ رسم و رواج اچھے ہوں یا بُرے، پسندیدہ ہوں یا ناپسندیدہ، اخلاقی اور مذہبی لحاظ سے جائز ہوں یا ناجائز ایک بار جب معاشرہ میں در آتے ہیں اور معاشرت میں سرایت کر جاتے ہیں تو وہ معاشرے اور معاشرت کا جزو لاینفک بن جاتے ہیں۔

نام و نمود عزت و توقیر اور معاشرتی مقام کے حصول کی خاطر افراد معاشرہ ان کی پاسداری اور ان پر عمل درآمد کو لازم سمجھنے لگ جاتے ہیں چاہے اس کے لیے انہیں مالی، ذہنی، قلبی اور روحانی اذیتیں اور کوفتیں ہی کیوں نہ اُٹھانی پڑیں۔ غیرت کے نام پر قتل، کاروکاری، ونی، سوارہ، قرآن سے نکاح اور جہیز وغیرہ کی رسموں کا شمار غیر اخلاقی، غیر قانونی اور بدترین رواجوں میں ہوتا ہے۔ لغو، فضول، بے جا، بے کار، لہو و لعب اور عیش و طرب کے مروّج طور طریقے محض افرادی تموّل و تفاخر کے اظہار کا ذریعہ ہیں مگر وہ خوشحال معاشرے کی علامت نہیں بن سکتے بلکہ اس کی بدحالی، پسماندگی، زوال اور بربادی کا باعث ثابت ہوتے ہیں۔

رسم و رواج کو مغربی تعلیم و تمدّن کے زیرِ اثر "فیشن" کہا جاتا ہے جو محض دیکھا دیکھی کا نام ہے جس کا کوئی قاعدہ و کلیہ نہیں جس کی نہ ابتدا کا کوئی پتہ ہے نہ اسکی انتہا کی خبر وہ سراسر تقلید اور نقل

Marfat.com

ہے۔ جو مختصراً بھیڑ چال کا دوسرا نام ہے مگر میں سمجھتا ہوں کہ کسی رسم اور ریت کو فیشن کہہ دینا عوامی زبان میں اسے بلند اور مقبول مقام دینے کے مترادف ہے مگر مجاز کے پردے میں میرے نزدیک اس سے نفرت، بیزاری اور نامقبولیت کا اظہار ہے۔ بس ہمیں کوشش کرنی چاہیئے کہ ہم سب مل جل کر اچھے، بہتر، مفید اور کارآمد انداز واطوارِ زیست کو اپنائیں اور فروغ دیں۔

دورِ جدید میں آج کل دو طرح کے راجوں کا رواج عام ہے _____ صدارتی اور پارلیمانی اور فوجی وسول _____ مگر ڈاکو راج اور پولیس راج کو جو روایت چل نکلی ہے اس سے بھی انکار ممکن نہیں۔ حالات کے سدھار اور حکمرانی کے تحفظ کے لئے گورنر راج اور مارشل لا کا راج بھی نافذ کیا جاتا ہے۔ عورت کے راج کو اگرچہ مرد حضرات پسند نہیں کرتے مگر نا معلوم وہ اسے دلوں پر راج کرنے کو کیوں پسند کرتے ہیں۔ میرے خیال میں اصل راج عدالتی راج ہے جو حق وانصاف اور اصول وقوانین پر مبنی ہوتا ہے اسے ہم ججوں کا راج کہہ سکتے ہیں جو جرنیلوں کے راج کی ہمیشہ نفی کرتا ہے مگر یہ اور بات ہے کہ بعض اوقات نظریہ ضرورت کے تحت عدالتیں کسی راج کی تبدیلی کا جواز پیش کر دیتی ہیں۔ حکمران مختلف ایجنسیوں اور میڈیا کے ذریعے سے اپنے راج کی بقا کا سامان فراہم کرتے ہیں مگر میڈیا والے ہیں کہ وہ اپنا راج ہر طبقہ پر قائم رکھنے کی سعی کرتے رہتے ہیں۔

راج کرنے کی خواہش ہر کسی کے دِل میں جاگزیں ہوتی ہے۔ افسر ہو یا باس، سیاستدان ہو یا بیوروکریٹ، مرد ہو یا عورت، بچہ ہو یا بوڑھا ہر کوئی یہی چاہتا ہے کہ اسی کا راج چلے اور اسکی مرضی کے خلاف کبھی کچھ نہ ہو مگر سچ تو یہ ہے کہ راج تخت کی الٹ پلٹ ایک تاریخی حقیقت ہے۔

راج کرنے کا اسلامی نقطۂ نظر یہ ہے کہ سَیِّدُالقَومِ خَادُمھُم یعنی "The Ruler of the People is the Servent of the people" اور یورپین ہمارے اس نظریہ کو تسلیم کرنے کے باوجود عمل اپنے ہی نظریہ حکومت پر کرتے ہیں کہ "Divide and Rule" یعنی "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" مگر سکھوں کا یہ نعرہ کہ "راج کرے گا خالصہ اقی رہے نہ کو" ایک جھوٹا دعویٰ ہے کیونکہ سدا کی بادشاہت تو صرف خدائے واحد کی ہے جو ابد سے ہے اور ابد الآباد کے بعد بھی قائم ودائم رہے گی۔

راج اور رواج کی بحث کو سمیٹے ہوئے میرے خیال میں اتنا کہنا کافی ہوگا کہ راجاؤں

Marfat.com

کے راج کرنے کے زمانے اب گزر چکے ہیں۔ بادشاہت کا دور ختم ہو چکا ہے۔ زمانہ اور اس کے اطوار بدل چکے ہیں۔ روایتوں اور اقدار میں تبدیلی آ چکی ہے۔ دور جدید جمہوریت کا دور ہے اس لئے حکمرانی میں وہ سابق آن بان، کرّ وفرّ، شان وشوکت، جاہ وجلال اور جبر و استحصال قصۂ پارینہ بن چکے ہیں۔ اب اعتدال اور احتساب کا زمانہ ہے مگر یہ اور بات ہے کہ جابر قوتیں آج بھی جہانگیری، جہانبانی اور جہاں رانی کے لئے زور و جبر اور سامراجی استبداد کے پرانے طور اطوار کو نئے ڈھنگ اور نئے نام سے اپنائے بیٹھے ہیں۔ رہی بات رواج کی تو اس ضمن میں بھی یہی عرض ہے کہ لکیر کے فقیر بننے کے بجائے فضول اور فرسودہ رسم ورواج کو خیر باد کہنا اور ان کی تقلید سے باز رہنا ہی علم وعقل کا تقاضا ہے اور ہاں سب سے اہم بات یہ ہے کہ دلوں پر راج کرنے کے لئے باہمی راہ ورسم میں خلوص، ہمدردی، معاونت، شفقت، پیار، محبت، غمگساری اور حوصلہ افزائی جیسے زرّیں اصولوں کی پیروی ضروری ہے مگر یہ الگ بات ہے کہ ہنڈا موٹر سائیکل کی تشہیری مہم میں یہ اعلان اکثر سننے میں آتا ہے کہ ''میرے دل پر ہنڈا راج کرے''۔

Marfat.com

راز اور نیاز

راز بھید کو اور نیاز نذر (تبرک) کو کہتے ہیں۔ راز چھپایا جاتا ہے اور نیاز پیر و مرشد کے حضور پیش کی جاتی ہے یا کسی بزرگ کے نام پر دلوائی جاتی ہے۔ اسے ہم دریشوں کا تحفہ بھی کہہ سکتے ہیں اور بزرگوں کے مزاروں پر چڑھاوے کا نام بھی دے سکتے ہیں۔

راز دو کے درمیان کی چیز ہے جو صرف رازداروں اور رازدانوں کے مابین ہوتی ہے۔ راز کی بات خفیہ ہوتی ہے اور پوشیدہ رکھی جاتی ہے اور نیاز سے صرف نیازمندی کا اظہار ہوتا ہے۔ راز اپنوں سے اپنائیت اور بیگانوں سے بیگانگی کے اظہار کی علامت ہے۔ اس میں اپنوں کے لئے مصلحت، بھلائی اور اصلاح کی روح کارفرما ہوتی ہے جو دوستی اور بہی خواہی کی مظہر ہوتی ہے اور اس میں بیگانوں کے ضرر اور زیاں کے خوف سے محفوظ رہنے کی ترکیب و تدبیر مضمر ہوتی ہے۔ نیاز میں عقیدت و ارادت کا اظہار مقصود ہوتا ہے اور اگر اس میں نمود کا پہلو غالب ہو تو اسکی حقیقت مفقود ہو جاتی ہے۔ یوں راز میں فرزانگی اور نیاز میں شوق و محبت اور عقیدہ کی وابستگی عیاں ہوتی ہے۔

بات اگر اپنی زبان تک محدود رہے تو بات ہے مگر جب دوسروں سے کہہ دی جائے تو یہی بات راز بن جاتی ہے مگر جب دو دوست باہمی گفتگو کرتے ہیں تو ان کی باتیں باہم رازداری کی ہوتی ہیں اور زوجین کی بات چیت راز و نیاز کے زمرہ میں آتی ہے۔ اہلِ حرفہ اور اہلِ ہنر اپنے اپنے پیشوں کے رازوں کو اچھی طرح جانتے اور پہچانتے ہیں اور انہیں بڑے ہنرمندانہ انداز میں بروئے کار لاتے ہیں۔ اور ''رموزِ سلطنت خویش خسرواں دانند'' کے مصداق اپنی مملکت کے رموز خود حکمران ہی جانتے ہیں۔ مگر یاد رہے کہ راز کی بات ایک امانت ہوتی ہے جس کی حفاظت فرض سمجھ کر کی جانی چاہیئے۔

راز ایک سربستہ امر ہے یہاں تک کہ تخلیق کائنات اور خلق آدم میں بھی ایک راز پوشیدہ ہے اور خود خالقِ کائنات بھی سراپا راز ہے حیات بھی راز ہے اور موت بھی راز ہے قیامت بھی ایک راز ہے۔ دنیا بھی ایک راز ہے اور آخرت بھی ایک راز ہے۔ جسم کی فنا اور روح کی بقا بھی راز ہے۔ عمل

Marfat.com

تولید میں افزائش نسل کا راز مخفی ہے اور فصلوں اور پودوں کی نمو اور رنگینیٔ کائنات میں بھی رموز واسرارِ الٰہیہ ہی پوشیدہ دکھائی دیتے ہیں۔ عشق بھی راز ہے اور محبت بھی راز ہے۔ عشق ومحبت، عاشق ومعشوق اور محبّ ومحبوب میں راز ونیاز کی باتیں سب راز ہی تو ہیں جس کا احساس ہمیں خدا تعالیٰ اور محبوب خدا کی باتیں یاد کرنے سے ہوتا ہے۔ شاعر کیا خوب یاد دلاتا ہے:

خدا نے محبت سے کاڑھا ہے نور
نہ ہوتی محبت نہ ہوتا ظہور

عارفان خدا اور صوفیائے کرام اسرار ورموزِ کائنات کی جستجو کرتے ہیں اور دنیا والوں کو ان کی ماہیّت کا شعور دلانے کی سعی کرتے ہیں۔ علماء وفضلاء اپنے علم وفضل، فہم وفراست اور دانست سے حسبِ بساط ان سے آگاہی حاصل کرنے اور دوسروں کو ان سے آگاہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یوں ہمیں بہت سے رازوں کا پتہ چلتا ہے مگر اکثر راز پھر بھی نہیں کھلتے بلکہ ان کے ساتھ ساتھ دیگر راز پیدا ہو جاتے ہیں اور یوں راز ہائے نہاں نہاں ہی رہتے ہیں اور عمریں بیت جاتی ہیں مگر راز نہیں ملتے۔

سماج اور معاشرہ کی فلاح و بہبود اور ان کی بقا واستحکام کے بھی کچھ راز ہوتے ہیں جن کی رازداری لازم متصوّر ہوتی ہے اور کچھ راز ایسے ہوتے ہیں جن پر پردہ ڈالنا اور بعض سے پردہ اُٹھانا بھی ضروری ہوتا ہے_____ یاد رہے کہ کسی کی معصیّت کی پردہ دری بذاتِ خود ایک معصیّت ہے اور معصیّت کی پردہ پوشی صفتِ الٰہیہ کی مظہر ہے۔

دوسروں کے راز جاننے کی ٹوہ میں رہنا اور چھپ چھپا کر دوسروں کی باتیں سننا بہت بڑا عیب ہے مگر تحقیق وتفتیش میں راز معلوم کرنے کی سعی کرنا اور ان کا کھوج لگانا بڑے کمال کی بات ہے لیکن پولیس کا مجرموں سے راز اگلوانے کے سلسلے میں جسمانی اور ذہنی تشدّد کا کوئی جواز نہیں البتہ ملک وقوم کے راز دشمنوں کو بتانا سراسر بغاوت اور یقیناً قابلِ تعزیر امر ہے۔

دل رازوں کا مدفن ہے۔ دل کی وسعت بے پایاں ہے اور اس میں بے شمار اور لاتعداد راز بیک وقت سمائے رہتے ہیں اور اکثر راز ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس میں دفن ہو کر رہ جاتے ہیں اور سچ بھی تو یہی ہے کہ رازوں کو دل میں سمائے رکھنا بڑے دل گردے کا کام ہے اور یہ کام صرف مردوں کا ہے جن کا دل قوی اور وسیع ہوتا ہے۔ یہ عورتوں کے بس کی بات نہیں کیونکہ وہ پیٹ کی

Marfat.com

ہلکی اور دل کی کمزور ہوتی ہیں اس لئے ان کے پاس کبھی کوئی راز چھپائے نہیں چھپتا مگر اس کے باوصف یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ عورتیں بڑے بڑے رازوں کو ایسا چھپا لیتی ہیں کہ انہیں اپنے ساتھ قبر میں لے جاتی ہیں ایسا ہو بھی کیوں نہ ہو کہ عورت خود ایک راز ہے۔

راز، نیاز اور راز و نیاز کی ان مذکورہ باتوں سے مختصراً یہی نکتہ نکلتا ہے کہ راز ایک مقدس امانت ہے اور اس کی حفاظت فرض ہے کیونکہ راز اسی وقت تک راز ہے جب تک چھپایا جائے یا چھپا رہے اس کی پوشیدگی ہی میں اس کی بقا ہے اور افشائی میں فنا ہے اور نذر و نیاز اظہارِ عقیدت اور حصولِ سعادت کی ضامن ہے جبکہ راز و نیاز کا معاملہ دو دلوں کی یکجائی کا راز ہے۔

Marfat.com

رُت اور رُوپ

رُت فصل، زمانہ اور موسم کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے اور رُوپ وضع قطع، شکل وصورت، ڈھنگ، بھیس، حُسن، جوبن اور آب وتاب کے معنی دیتا ہے۔ دونوں الفاظ ہندی الاصل ہیں اور دونوں میں بدلنے اور بگڑنے کی صلاحیت قدرِ مشترک ہے۔

ہر رُت اپنا ایک روپ رکھتی ہے اور ہر روپ میں ایک نئی رُت نظر آتی ہے۔ رُت جب بدلتی ہے تو لوگ خوراک اور لباس میں تبدیلی لانے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور جب کوئی شخص اپنا رُوپ بدلتا / بھرتا ہے تو اس کی صورت نئی دکھائی دیتی ہے اور بعض اوقات تو اس کی پہچان بھی مشکل ہو جاتی ہے۔ اور اکثر لوگ اس کی بدلی ہوئی صورت کو دیکھ کر اسے مکار اور فریبی بھی کہنے لگ جاتے ہیں مگر اُردو کا یہ مقولہ "رُوپ بھرنے میں بھی کمال چاہیئے" بڑے کمال کا ہے جس کا مفہوم دراصل یہ ہے کہ ادنیٰ کام بھی عقل کے بغیر نہیں ہو سکتا ہے۔

فصل گل میں رُت جب نکھرتی ہے تو خوشیاں بکھرتی ہیں۔ سبزہ اُگتا ہے اور پھول کھلتے ہیں جن سے آنکھوں کو طراوت اور روح کو سرور و تازگی ملتی ہے۔ طبعیت میں امنگیں اور خواہشیں اٹھتی ہیں اور دل میں ایک عجیب سا ہیجان پیدا ہوتا ہے اور مادہ جانور تک بھی "رُت / بہار" میں آ جاتے ہیں۔ اور مزید یہ کہ رُت کے میوے کھانے کو ملتے ہیں۔

برکھا رُت ماحول میں نمی اور روئیدگی کا باعث بنتی ہے اور کبھی کبھی اس کی شدّت طوفانوں اور سیلابوں کا خوف دلا کر دلوں کو ہلا کر رکھ دیتی ہے اور جان و اموال کی تباہی کا سبب بن جاتی ہے۔ گرما رُت اور سرما رُت کی آمد پر لوگ ان کی شدّت سے بچاؤ کی احتیاطی تدابیر و اقدامات کا اہتمام کرنے لگ جاتے ہیں مگر پھر بھی لُو اور سردی لگ جانے سے بچے اور ضعیف جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ غرض ان کڑی رُتوں کے رُوپ جب اپنے پورے جوبن پر ہوتے ہیں تو وہ سب جانداروں اور چرند پرند کو اپنے اپنے رنگوں میں رنگ دیتے ہیں یعنی ان کے رُوپ بھر دیتے ہیں اور کبھی کبھار ان کے رُوپ بگاڑ بھی دیتے ہیں لیکن

Marfat.com

ایک روپ ونتی جب اپنا رُوپ بناتی ہے یعنی بنتی سنورتی ہے اور ایک دلہن جب اپنا روپ بھرتی ہے اور گہنے پہن کر اسے چار چاند لگاتی ہے تو وہ اپنے رُوپ کی جھلک دکھا کر حسین سے حسین تر بن جانے کی سند حاصل کر لیتی ہے اور دیکھنے والے مسحور ہو کر دیکھتے ہی رہ جاتے ہیں۔ یوں سمجھئے کہ ان کا "رُوپ درشن" دیکھنے والوں کو حیرت میں ڈال دیتا ہے کیونکہ ان کا "رُوپ چھاتا" آنکھوں کو خیرہ اور دل کو پُر حسرت کر دیتا ہے مگر بعض اوقات "رُوپ روئے اور کرم کھائے" کی مثل بھی اپنی حقیقت و اصلیّت کی صداقت کا بگل بجا دیتی ہے جس سے بدنصیب حسینوں کے مصیبت بھرنے اور خوش قسمت بدصورتوں کے عیش و عشرت منانے کی صدا سنائی دیتی ہے۔

رُوپ "رُوپا" کا مخفف بھی ہے جو سیم، نقرہ، چاندی کے معنی دیتا ہے۔ اسی مناسبت سے چاندی کا گشتہ "رُوپ رس" کہلاتا ہے اور "رُوپ درشن" (نذرانۂ سیم و زر یعنی رشوت) سے جلد کام نکالنے کا آسان طریقہ سمجھا جاتا ہے۔ ہندو لوگ منگنی کے نشان کو "رُوپنا" کہتے ہیں اور چاندی کی سی صورت (رنگ ڈھنگ) کو "رُوپہلا" یا "رُوپہلی" کہا جاتا ہے۔

مجھے اعتراف ہے کہ رُت اور رُوپ کی ان باتوں سے میری کوشش کے باوجود ان دونوں میں کوئی مشابہت، موازنت یا مسابقت پیدا نہیں ہو سکتی۔ میری باتیں نہ تو کماحقہٗ رُت کے رُوپ کو ابھار سکتی ہیں اور نہ رُوپ کی رُت کو اجاگر کرنے میں کامیاب ہو سکتی ہیں۔ میں تو بس اسی نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ رُت رُت ہے اور رُوپ رُوپ ہے تاہم رُت کے رُوپ کا نظارہ کر کے دل کو خوش ضرور کرنا چاہیئے اور رُوپ کی رُت سے بروقت متمتع ہونے کی سعی ضرور کرنا چاہیئے مگر ''رُت بدلی رُوپ بدلا'' کے مصداق اپنے اندر مثبت تبدیلی کو منفی تبدیلی پر بہر نوع ترجیح دے کر اپنا بہتر رُوپ اپنانے کی کوشش کرنا چاہیئے کیونکہ میرے خیال میں یہ کوشش آپ کی شخصیت میں یقیناً نکھار لانے کا باعث بنے گی اور دیکھنے والے آپ کے اس رُوپ کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھیں گے۔

Marfat.com

رَستہ اور رِشتہ

رستہ (راستہ) کو فارسی میں راہ اور عربی میں صراط کہتے ہیں اس کے معنی (سڑک، گزر، شارع) (میل جول، آشنائی) (سفر، مسافرت) (ڈھنگ، طریقہ) (غرض، مطلب) (رسم، رواج) (رابطہ، رسائی) (خبر، آگاہی) کے ہیں اور

رشتہ فارسی کا لفظ ہونے کے ناتے سے مندرجہ ذیل معنی رکھتا ہے (دھاگا، تاگا) (قُرابت، رشتہ داری) (تعلق، واسطہ) (لڑی، قطار) (ایک مرض جس میں دھاگے کے مانند ایک مادہ جسم سے نکلتا ہے)۔ راستے کو انگریزی میں Path یا way کہتے ہیں اور رشتے کو Relatoin کہتے ہیں۔

راستے میں سفر کا مفہوم بہرنوع موجود ہوتا ہے جسے طے کرنا لازم ہوتا ہے ہر راستے کی ایک منزل ہوتی ہے اور ہر راہ اختیار کرنے کا ایک مقصد ہوتا ہے۔ ہر مقصد کو پانے یا کسی منزل پر پہنچنے کے لئے راہرو جو بھی سعی کرتا ہے اسے راستہ ہی کہتے ہیں۔

راستہ چلنے اور طے کرنے کے لئے ہوتا ہے اور رشتہ جوڑنے اور نبھانے کے لئے ہوتا ہے۔

زندگی ایک راستہ ہے۔ ایک شاہراہ ہے جس سے کئی راستے مربوط ہیں مثلاً مشترکہ اقدار کی پاسداری کا راستہ۔ رواداری اور خوش اخلاقی کا راستہ۔ راستی اور خلوص کا راستہ۔ دین کا راستہ (صراطِ مستقیم) لادینی کا راستہ (غلط راستہ) مسند اقتدار تک پہنچنے کا راستہ (سیاسی راستہ)۔ غلامی سے آزادی پانے کے لئے جہاد کا راستہ۔ اپنی بات منانے کے لئے احتجاج کا راستہ۔ کسی کو زیرِ نگین لانے کے لئے تشدد کا راستہ۔ اولاد کی تربیت کے لئے ان کی صحیح تربیت کا راستہ تاکہ وہ غلط راستے پر نہ چل نکلے اور گمراہ یا بے راہرو نہ بنیں۔

راستے کو درج ذیل قسموں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

اجنبی راستے: جن کی منزلیں بھی اجنبی ہوتی ہیں۔

دل کے راستے: جن کی منزل وصال ہوتی ہے۔

Marfat.com

آمریت کا راستہ: جس کی منزل جمہوریت کا قتل ہوتی ہے۔

جمہوری راستہ: جس کی منزل آمریت کا خاتمہ ہوتی ہے۔

زندگی کا راستہ: راہِ حیات جس کو جیسے تیسے بھی ممکن ہو طے کر کے موت کی منزل کو پہنچنا ہوتا ہے۔

آبی راستے: آبی مخلوق کے ہوتے ہیں جن کی دیکھا دیکھی حضرت اِنسان نے جہازوں کے لئے متعین کر رکھا ہے۔

فضائی راستے: پرندوں کے ہوتے ہیں جن پر اِنسانوں نے طیارے اُڑانے شروع کر دیے ہیں۔

صحرائی راستے: جو صرف اونٹ طے کر سکتے ہیں۔

پہاڑی راستے: جو بلندیوں پر بڑے پُر پیچ ہوتے ہیں اور چوٹی تک پہنچتے ہیں مگر مہم جو اِنسان ان چوٹیوں کو بھی سر کر لیتے ہیں۔

اسی طرح راستے مشکل، آسان، دشوار گزار اور پُر خطر بھی ہوتے ہیں مگر عافیت/سلامتی کا راستہ یہی ہے کہ ہوس اور لالچ کا راستہ اختیار نہ کیا جائے اور اس کے لئے جان کو جوکھوں میں نہ ڈالا جائے۔

راستے کے کچھ خصائص و موانعات بھی ہوتے ہیں جن کے پیشِ نظر احتیاط و حفاظت کے اقدامات کی ضرورت ہوتی ہے۔ برف باری سے راستے بند ہو جاتے ہیں۔ بارش سے پھسلن پیدا ہو جاتی ہے۔ طوفان سے بے نشاں ہو جاتے ہیں۔ ٹریفک جام ہو جائے تو مسدود ہو کر رہ جاتے ہیں VIP کا گزر ہو تو صاف کر کے روک دیئے جاتے ہیں۔ امن و امان کا مسئلہ ہو تو راستوں پر پہرے لگا دیئے جاتے ہیں اور اگر نئے راستوں کی تعمیر و مرمّت مقصود ہو تو متبادل راستے متعین کئے جاتے ہیں مختصراً یہ کہ ایسے تمام حالات و اقدامات عوام کی ذلت و خواری کا باعث بنتے ہیں۔

راستے ہموار اور ناہموار ہونے کے علاوہ سنگلاخ بھی ہوتے ہیں اپنے مقصد کو پانے اور منزل پر پہنچنے کے لئے ان کی رکاوٹوں اور دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے بہتر ہے کہ آسان اور مناسب راستے کا انتخاب کیا جائے اور سب سے اچھی بات تو یہ ہے کہ اپنا راستہ خود بنانا چاہیئے جیسے

Marfat.com

کہ پانی اپنا راستہ خود بناتا ہے اور ہمیشہ پستی میں چلتا ہے اور سدا ہموار رہتا ہے اور ہر رکاوٹ سے سر ٹکرا کر اسے دور کرتا ہوا عازمِ سفر رہتا ہے۔

راستے میں کانٹوں سے بھی واسطہ پڑتا ہے انہیں بھی راہ سے ہٹانا ضروری ہوتا ہے۔

راستے میں پتھروں کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے جنہیں راہ سے ہٹانا بھی ضروری ہوتا ہے۔ راستے بدلنے سے منزلیں بھی بدل جاتی ہیں۔

صلح صفائی کے لئے " کچھ لو کچھ دو" کا درمیانی راستہ ڈھونڈ نکالنا مفید ہوتا ہے۔ کچھ راستے لمبے ہوتے ہیں اور کچھ مختصر۔ بعض راستے جدا جدا بھی ہوتے ہیں اور جدا کئے بھی جاتے ہیں اور ہو بھی جاتے ہیں ڈیڑھ اینٹ کی مسجد جدا چننا کا محاورہ بھی اسی خیال سے نکلا ہے۔ اسی طرح دلّی کا راستہ تو ہر کوئی دکھا دیتا ہے مگر زادِ راہ پلّے نہیں باندھتا۔

راستے کے اس تمام تر ذکر کا مقصد صرف اتنا ہے کہ سفرِ حیات کو بڑی احتیاط اور دانشمندی سے طے کیا جانا چاہیئے تا کہ دنیاوی زندگی کا یہ سفر جب اخروی زندگی سے جا کر ملے تو ابدی زندگی ہر لحاظ سے راحت و سکون کا گہوارہ ثابت ہو۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ دانشوروں کے اس مقولے پر عمل کیا جائے کہ

"جنت کا راستہ علم اور دوزخ کا راستہ جہالت ہے"

رشتہ باہمی اتحاد و یگانگت اور میل ملاپ کا نام ہے جس طرح راستہ شہروں کو ایک دوسرے سے ملاتا ہے ہے اسی طرح رشتہ دلوں کو آپس میں ملاتا اور جوڑتا ہے۔

انسان دنیا میں مختلف رشتوں کی ڈور سے بندھا ہوتا ہے اور اس کی کوشش ہوتی ہے کہ زندگی بھر یہ ڈور بندھی رہے اور کبھی نہ ٹوٹنے پائے۔ آدمی کا سب سے پہلا رشتہ خون کا قدرتی رشتہ ہے جو ماں باپ اور خاندان کے دیگر لوگوں میں ہوتا ہے اس کے بعد دوسرا رشتہ ملاپ کا ہے جو انسان گھر سے باہر عزیز و اقارب اور دوستوں کے ساتھ بناتا ہے۔ یہ رشتہ محبت کا بھی ہوتا ہے اور درد کا بھی۔ ان دو طرح کے رشتوں کو عموماً انفرادی طور پر اپنایا جاتا ہے مگر اجتماعی طور پر انہیں وسعت دے کر بنی نوع انسان کے لئے مفید بنایا جا سکتا ہے۔

رشتے بنانے اور نبھانے کے لئے پیار اور خلوص ضروری ہوتا ہے مگر پیار نبھانے کے لئے کسی رشتے کی ضرورت نہیں ہوتی اور جھوٹ کبھی رشتے نہیں جوڑتا بلکہ سچ ہی ہے جو رشتے جوڑتا ہے اسی

Marfat.com

سے رشتے گہرے اور گاڑھے بنتے ہیں۔

رشتہ ایک جوڑ ہوتا ہے جو ایک دوسرے کو باہم جوڑتا ہے۔ ایک بندھن ہوتا ہے جسے باہمی پیار و محبت عزت و احترام اور خلوص و ایثار سے قائم رکھا جاتا ہے بس یہی وہ کلیہ ہے جس سے رشتے بنائے، جوڑے اور نبھائے جاتے ہیں۔ یاد رہے کہ رشتوں کے بنانے اور بگاڑنے میں وقت اور ضرورت کا کردار بڑا اہم ہوتا ہے۔ وقت اور ضرورت کے ہاتھوں اکثر اوقات رشتوں کا خون بھی ہو جاتا ہے اور وہ ٹوٹ بھی جاتے ہیں۔ کوشش یہی ہونی چاہیئے کہ رشتوں کا کبھی نہ خون ہو اور نہ وہ کبھی ٹوٹنے ہی پائیں۔ کہتے ہیں کہ رشتے زندگی سے ہوتے ہیں مگر میں کہتا ہوں کہ رشتے موت کے بعد بھی قائم رہتے ہیں _____ یادوں کی صورت میں _____ تعلق اور نسبت کو زندہ رکھنے کے لئے _____ کیونکہ رشتوں کی یادوں کی کبھی نہ کبھی ضرورت آن ہی پڑتی ہے۔

رشتہ ایک ایسا راستہ ہوتا ہے جس کی منزل ملاپ ہی ہوتی ہے اور راہ و رسم ایک ایسا راستہ ہے جو رشتے قائم کرتا اور رکھتا ہے اور خلوص اور پیار وہ راستہ ہے جو پرایوں کو بھی اپنا بنا لیتا ہے۔

رشتہ کوئی بھی بُرا نہیں ہوتا چاہے وہ ساس بہو کا ہو یا نند بھاوج کا۔ یہ صرف رویہ ہے جو کسی رشتے کو اچھا سے بُرا یا بُرے سے اچھا بنا دیتا ہے اور دوستی کا رشتہ سب رشتوں سے سچا اور سُچا ہوتا ہے کیونکہ یہی وہ مقدس رشتہ ہے جس کی بنیاد خلوص اور اعتماد پر ہوتی ہے اور جو ہماری پہچان کا سبب بنتا ہے اس لئے اس کا ہر حال میں احترام کرنا چاہیئے۔

منگنی کی انگوٹھی ایک ایسی علامت ہے جو انگوٹھی والوں کے علاوہ دوسروں کا بھی باور کراتی ہے کہ ان کا رشتہ قائم ہو چکا ہے تا کہ کوئی دوسرا مداخلت نہ کر سکے اور شادی ایک ایسا رشتہ ہے جو مرتے دم تک نبھایا جاتا ہے کیونکہ اس کا فیصلہ قبل از وقت آسمانوں پر طے ہو چکا ہوتا ہے مگر جب تک عورت اور مرد دو گواہوں کی موجودگی میں ایجاب و قبول کے بعد نکاح نامے پر دستخط نہ کر دیں رشتہ مؤثر نہیں ہوتا۔ اس کارروائی کے بعد میاں بیوی کے معاشرے میں باعزت مقام ملتا ہے۔ شادی نسل انسانی کی بقا کے لئے ضروری ہے اور بحیثیت مسلمان اخلاقی برائیوں اور ناجائز تعلقات سے بچاؤ کے لئے ایک مقدس اور نیک فریضہ ہے اور بزرگوں کے بقول شادی دو افراد کی نہیں بلکہ دو خاندانوں کے ملاپ کا ذریعہ ہے۔ پیار اور باہمی اعتماد و احترام کی بدولت ازدواجی زندگی کا

Marfat.com

توازن برقرار رہتا ہے مگر

انگریزوں کا یہ فلسفہ میری سمجھ سے تو بالکل ماورا ہے کہ شادی ایک معاہدہ (Contract) ہے جو کسی بھی وقت ٹوٹ سکتا ہے کیونکہ ہمارے نزدیک شادی ایک ایسا عقد ہے جو تا دم مرگ نبھانا ہوتا ہے اور اس کو توڑنا (یعنی طلاق دینا) ایک ایسا فعل ہے جسے ہمارے پیارے نبیؐ نے سب سے زیادہ ناپسند فعل قرار دیا ہے۔ ہندوؤں کے ہاں خاوند کی موت پر بیوی کے ستی ہو جانے کی رسم اگرچہ تازیست ساتھ دینے کی وعدہ ایفائی کی غماز ہے مگر یک طرفہ خودسوزی تک محدود ہے جس کا کوئی جواز نہیں یہ سراسر ناجائز اور قانونِ قدرت کے منافی ہے۔ مگر یاد رہے کہ رشتے اہم نہیں ہوتے۔ ان کو نبھانے کے طریقے اہم ہوتے ہیں نیز یہ کہ رشتے اپنائیت کے ہوں یا خلوص کے اتنے ہی نازک ہوتے ہیں جتنے کہ آبگینے۔ ذرا سی ٹھیس لگی تو ٹوٹ گئے۔ بدگمانی نے سر اٹھایا تو چکنا چُور ہو گئے۔ پھر ان پر فخر کیسا؟ کیسا مان؟

رَستہ اور رِشتہ کے مبحثِ بالا سے جو نتائج اخذ ہوتے ہیں انہیں یوں مرتب کیا جا سکتا ہے کہ

1- صحیح راستہ (صراطِ مستقیم) قرآن ہے جو اس راستے کی رہنمائی کرتا ہے جو سیدھا ہے۔ حلال و حرام کی پہچان کراتا ہے اور جس پر چلنے والے منعم کہلاتے ہیں اور اس سے منہ موڑنے والے مغضوب ہو کر رہ جاتے ہیں۔

2- رشتے ایثار اور قربانی کے متقاضی ہوتے ہیں۔

3- رشتے خلوص سے بنتے ہیں اور ایمانداری سے نبھائے جاتے ہیں۔

4- ایک رشتہ جوڑنے کے لئے دوسرے رشتوں کو ہرگز توڑنا نہیں چاہیئے اور نہ نئے رشتوں کی خاطر پرانے رشتے ختم کرنے چاہییں۔

5- رشتوں کو جوڑنا چاہیئے توڑنا نہیں کیونکہ یہ جب تک جڑے رہتے ہیں تو ہی رشتے کہلاتے ہیں۔

6- خونی رشتے لازوال ہوتے ہیں اور سیاسی رشتے وقتی، عارضی اور ناپائیدار ہوتے ہیں۔

7- اپنوں سے رشتے ہمیشہ استوار رکھنے چاہییں کیونکہ اپنوں سے رشتہ توڑنے سے انسان

Marfat.com

خودٹوٹ جاتا ہے اور زندگی بے کیف ہو کر رہ جاتی ہے اور وہ راستہ (راہ) اختیار کرنا چاہیئے جو رشتوں کے استحکام اور بقا کا ہو۔

8- مسائل کے حل کے لئے ڈپلومیسی کا راستہ اختیار کرنا چاہیئے۔

9- مصالحت اور مفاہمت کے لئے مذاکرات کا راستہ اپنانا چاہیئے۔

10- امن کی خاطر مخالفت اور مخاصمت کے راستے سے گریز کرنا چاہیئے۔

بس مختصر یہ کہ رشتوں کے تقدس کو برقرار رکھنے کے لئے ان کی پرورش اور پوجا کرنی چاہیئے اور راستوں کا تعین سوچ سمجھ کر کرنا چاہیئے۔

Marfat.com

رونا اور ہنسنا

رونا اور ہنسنا اگرچہ متضاد الفاظ ہیں مگر دونوں فطری ہیں ہنسی کو خوشی کی علامت سمجھا جاتا ہے اور رونا غم کا غماز قرار دیا جاتا ہے یعنی انسان خوشی کے وقت ہنستا ہے اور غم کی وجہ سے روتا ہے۔ ہنسنے سے چہرہ کھل کھلا اٹھتا ہے اور رونے سے پژ مردہ ہو جاتا ہے۔ ہنسنے کی ابتدائی صورت مسکرانا ہے اور رونے کی چشم آبدیدگی ہے۔ ہنسنے کی انتہا قہقہ ہے اور رونے کی آہ وبکا۔ رونے میں سسکیاں بھری جاتی ہیں اور ہنسنے میں منہ پھولتا ہے اور شدت کے عالم میں اتنا کھلتا ہے کہ حلق تک نظر آتا ہے اور پیٹ میں بل پڑنے لگ جاتے ہیں۔ انسان ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو جاتا ہے مگر روتے روتے اس کی گھگی بندھ جاتی ہے۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا جاتا ہے اور وہ بے ہوش ہو جاتا ہے۔

رونے سے دل کا غبار ہلکا ہوتا ہے، دھلتا ہے اور ہنسنے سے دل کا شگوفہ کھلتا ہے۔ رونے اور ہنسنے کی شدت کی انتہائی کیفیات یہ ہیں کہ رونے سے آنکھوں سے آنسو بہتے ہیں اور ہنسنے سے منہ سے جھاگ۔ زیادہ ہنسنے سے آنکھوں میں آنسو بھی آجاتے ہیں۔

فطرت کے عمل پر اگر غور کریں تو یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ انسان جنم لیتے وقت ہنستا ہے اور اپنی موت کے وقت دوسروں کو روتا چھوڑ جاتا ہے۔ پیدائش سے موت تک کا عرصہ حیات کہلاتا ہے جسے انسان اپنے مقدر اور حالات کی بدولت یا تو ہنس کر گزار دیتا ہے یا پھر رو رو کر بسر کر لیتا ہے لیکن بعض دانشوروں کا یہ بھی کہنا ہے کہ یہ انسان کے اپنے بس کی بات ہے کہ چاہے تو اپنی زندگی کو رو کر گزارے یا ہنس کر گزار دے مگر حقیقت یہ ہے کہ زندگی میں ہنسنا اور رونا دونوں لازم وملزوم ہیں بلکہ یوں کہنا زیادہ مناسب ہے کہ زندگی ہنسنے اور رونے سے عبارت ہے کیونکہ بقول شاعر ''خوشی وغم میں توام ہیں'' لیکن بعض داناؤں کا یہ مشورہ نہ صرف غور طلب ہے بلکہ قابلِ عمل بھی ہے کہ ہنستے لوگوں کو رلانا مذموم فعل ہے مگر روتے لوگوں کو ہنسانا کمال کا عمل ہے۔

Marfat.com

طبی تحقیقات کے مطابق رونا اور ہنسنا انسان کی فطرت اور طرزِ عمل کے آئینہ دار ہوتے ہیں اور دونوں ہماری دلی کیفیات کا گرامافونی ریکارڈ ہے جس کے ذریعے سے نفسیات اور اخلاق کا اندازہ کیا جاسکتا ہے اس لئے اگر کسی شخص کی فطرت کا پتہ لگانا مقصود ہو تو اس کے طرزِ کلام، خاموشی اور رونے رلانے کو نہ دیکھیں بلکہ ساری توجہ اس کی ہنسی پر رکھیں تو صاف ظاہر ہوگا کہ پھوہڑ اور بدسلیقہ ہنسی ہنسنے والے میں وجاہت کی کمی ہوتی ہے اور اس کے برعکس سلیقے کے ساتھ ہنسنے والا پرتمکین اور وقیع ہوتا ہے۔ بعض لوگ جا و بے جا اور خواہ مخواہ ہی ذرا ذرا سی بات پر قہقہے لگا دیتے ہیں اور ایسی صورت بگاڑ لیتے ہیں کہ ان کے رونے اور ہنسنے میں کوئی امتیاز قائم نہیں کیا جاسکتا۔ یہ انسان بہت خطرناک ہوتے ہیں لیکن بعض حضرات اس طرح ہنستے ہیں کہ اپنی آس پاس کی دنیا کو گرما دیتے ہیں اور یہی ہنسی بے ضرر ہوتی ہے۔ لیکن خود ہنسنے والوں کا یہ کمال سمجھا جاتا ہے کہ وہ دوسروں کو بھی ہنسا دیتے ہیں اور دوسروں کے لئے خوشی کا سامان مہیا کرتے ہیں۔ بعینہٖ رونے والوں کا یہ کمال سمجھا جاتا ہے کہ وہ اگر دوسروں کو اپنے رونے میں شریک نہ کرسکیں تو کم از کم انہیں مغموم کر کے ان کی ہمدردیاں ضرور حاصل کر لیتے ہیں۔

پس ثابت یہ ہوتا ہے کہ ہنسنا اور رونا بتقاضائے بشریت فطری امر ہیں ان سے انکار و مفر جائز نہیں۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ خوشی کے موقع پر ہنسنا اظہار تشکر ہے اور غم کے وقت رونا صبر و رضا کا تقاضا ہے مگر دونوں میں اعتدال لازم ہے۔

Marfat.com

سوال اور جواب

سوال استفسار کا نام ہے اور جواب اس کی ضد ہے۔ سوال پوچھا اور کیا جاتا ہے جواب دیا اور سنا جاتا ہے۔ جس طرح بات سے بات نکلتی ہے اور نکتہ سے نکتہ پیدا ہوتا ہے اسی طرح سوال سے سوال اور جواب سے جواب پیدا ہوتے ہیں۔

سوالی اپنی حاجت کے لئے دست سوال دراز کرتا ہے۔ سخی اس کی حاجت روائی کے لئے اسے بخشیش دیتا ہے اور کنجوس اسے ٹکا سا جواب دے دیتا ہے اور یوں حکم ربی وَاَمَّا السَّائِلَ فَلَا تَنْهَرْ کا منکر بن کر گناہ کا مرتکب ہوتا ہے۔

عدالتی دعووں کا جواب اور جواب الجواب دیا جاتا ہے اور سماعت کے دوران وکیل کی جرح کے دوران سوالوں کا جواب ہاں یا ناں میں دیا جاتا ہے۔ شاعر کسی دوسرے شاعر کے کلام کا جب جواب لکھتا ہے تو اسے "جواب آں غزل" کا عنوان دیا جاتا ہے جو بطور ضرب المثل اس وقت استعمال ہوتا ہے جب کسی کے کہے سنے کا اسی انداز میں جواب دیا جاتا ہے۔ انکوائری اور انٹرویو میں زبانی سوال جواب ہوتے ہیں اور جب اس دوران میں کسی سوال کا جواب نہ بن پڑے تو آدمی منہ لٹکائے اور چہرے پر سوالیہ نشان بنائے چلتا بنتا ہے جبکہ ایک طالب علم کمرۂ امتحان میں پرچہ سوالات کے تحریری جوابات دیتا ہے اور جواب طلبی ہمیشہ لکھ پڑھ کر ہی کی جاتی ہے جس پر عملدرآمد جوابی کارروائی کہلاتا ہے۔

سوال اور جواب کی کئی صورتیں اور قسمیں ہیں مثلاً:

سیدھا اور اُلٹا، اُلٹا سیدھا اور اُلٹ پُلٹ، موافق اور ناموافق، معقول اور نامعقول، پسندیدہ اور ناپسندیدہ، عالمانہ اور جاہلانہ، اچھا اور بُرا، طویل اور مختصر، بامقصد اور بے معنی، صاف اور ناصاف، واضح اور غیر واضح، اعلیٰ اور ادنیٰ، زبانی اور تحریری، سچا اور جھوٹا، دانشمندانہ اور احمقانہ، تسلی بخش اور غیر تسلی بخش وغیرہ وغیرہ۔

انسان اپنے افعال و اعمال کا ہر لحاظ سے اور ہر حیثیت سے جوابدہ ہے۔ اس کی جوابدہی

Marfat.com

سب سے پہلے اپنے ضمیر کے سامنے ہوتی ہے اور سب سے آخر میں روزِ محشر کو خدا تعالیٰ کے روبرو جب اس کا اعمال نامہ اس کے ہاتھوں میں دیا جائے گا۔ صدائے ضمیر اس کے ہر فعل کے نیک و بد ہونے کی سند جاری کرتی ہے اور خدا تعالیٰ کا فیصلہ اخروی وابدی جزا وسزا پر منتج ہوتا ہے۔

سوال وجواب اور قیل وقال (مذاکرات) کی طوالت وتکرار عام طور پر خفگی اور ناراضی کا سبب بن کر بے ثمر رہتی ہے، کبھی کبھار اس سے کئی طرح کے مسائل اور الجھنیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ بعض اوقات اس سے دنگا فساد، لڑائی جھگڑا اور جنگ وجدل کی صورت بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ لہٰذا اس سلسلۂ سوال وجواب کا مختصر، موزوں اور موقع کے مطابق معقول اور محتاط رویّہ اپنانے کی ضرورت ہے اور اسی میں مصلحت ہے۔ اور بالکل خاموش رہنے کی صورت میں عافیت کا امکان بھی ہوتا ہے اور عافیت ناممکن بھی ہوتی ہے۔

بحث ومباحثے میں ترکی بہ ترکی سوال وجواب کی بوچھاڑ ہوتی ہے جس میں تندی وتیزی کے ساتھ ساتھ تلخی وترشی بھی پائی جاتی ہے مگر جوابی حملوں کا تحمل اور معقولیت کے رویہ سے تدارک کرنا اپنا جواب نہیں رکھتا۔ اور جہلاء کے سوالوں کے جواب میں خاموش رہنا ہی دانشمندی ہے کیونکہ وہ کسی بھی بات کو ماننے پر کبھی آمادہ نہیں ہوتے۔

سوال وجواب تعلیم وتعلّم کا ایک بنیادی اور موثر ذریعہ ہے اس سے علم وشعور کی دولت ملتی ہے اور واقفیّت اور معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ طفلانِ کوچک کو دیکھیئے وہ سوال کرنے میں اپنا جواب نہیں رکھتے اور سوال پر سوال کر کے ہر چیز سے آگاہی پاتے ہیں اور اپنے سوالوں کا جواب پا کر بڑے خوش ہوتے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ان کے سوالات کے معقول جوابات دے کر انہیں مطمئن کرنا چاہیئے۔ طفلانِ مکتب بھی سوال کے ذریعے سے ہی جواب پا کر اپنی علمی کمی کو پورا کرتے ہیں۔ غرض استاد، مبلّغ ناصح اور واعظ سب اسی کلیہ کے تحت تعلیم وتدریس اور رشد وہدایت کی تبلیغ واشاعت کرتے ہیں۔ دفتری امور طے پاتے ہیں اور تجارتی کاروبار فروغ پاتا ہے۔

سوال جواب کی اس بحث کے بعد یہی نتائج سامنے آتے ہیں کہ:

i: سوال ضرور کیجئے اس سے علم میں اضافہ ہوتا ہے اور سکون ملتا ہے مگر سوالی (گداگر) نہ بنیئے کیونکہ یہ عزت وغیرت کے سراسر منافی ہے۔

Marfat.com

ii: ہر سوال کا جواب ضرور دیجیئے مگر سوچ سمجھ کر اور شافی وکافی یعنی صاف، واضح، قطعی اور معقول۔

iii: سوالی کو کبھی صاف اور تلخ جواب نہیں دینا چاہیئے۔ حتی الواسع اس کی حاجت روائی کرنی چاہیئے کیونکہ حدیث پاک میں آیا ہے کہ جو دوسروں کی حاجت روائی کرتا ہے خدا تعالیٰ اس کی حاجتوں کو پورا فرماتا ہے۔

iv: سوال ہو یا جواب ہمیشہ باصواب ہونا چاہیئے تا کہ کسی کی دل آزاری نہ ہو اور "سوال کچھ اور جواب کچھ" کی مثال صادق نہ آئے۔

v: فارسی کی اس لاجواب مثل "جواب جاہلاں باشد خموشی" پر عملدرآمد یقیناً بے مثل ہے۔

Marfat.com

شراب اور شباب

شراب عربی لفظ شرب سے مشتق ہے جس کے معنی وہ رقیق شے ہے جو پی جائے اور شراب پینے والی چیز ہوتی ہے۔ پانی ہو یا شربت، دودھ ہو یا چائے، جوس ہو یا سوڈا واٹر، شوربہ ہو یا یخنی، دوا ہو یا سیرپ غرض ہر پینے والی شے شراب ہے البتہ زہر پینا مہلک ہے اور غصہ پینا فائدہ مند ہے۔ شراب سے جو بادی النظر میں مفہوم لیا جاتا ہے وہ نشہ آور مشروب ہے جو گنا، جو اور انگور سے تیار کیا جاتا ہے۔

شباب کے معنی اٹھان اور ابھرن کے ہیں اس سے مراد جوانی کا عنفوان (اٹھنا، آغاز) ہے جو بیس سے چالیس برس تک کی عمر پر محیط سمجھا جاتا ہے۔ مگر عام طور پر اسے جوانی ہی کہا جاتا ہے جو عمر کا بہترین حصہ متصور ہوتا ہے جس کی مستیاں بلکہ خرمستیاں زبان زد عام ہیں۔ کیونکہ اکثر یہی کہا جاتا ہے کہ جوانی مستانی ہوتی ہے۔ عالم شباب میں جوانی کا نشہ نوجوان کو مست و مدہوش کر دیتا ہے وہ بے خودی، خودسری اور بے خوفی کو اپنا لیتا ہے۔ بے خطر مہمات میں کود پڑتا ہے۔ وہ ہر کام اپنے کس بل اور زور و جبر کے بل بوتے پر کرتا ہے۔ وہ نہ کسی کو خاطر میں لاتا ہے اور نہ انجام کی پروا کرتا ہے۔ حماقتوں، شرارتوں اور شیطانیوں پر اتر آتا ہے اور راہِ راست سے بہک بھٹک کر راہِ عشق کو جوانی کا لازمہ سمجھ کر اختیار کر لیتا ہے اور یوں عشق کا روگی بن کر اپنی جوانی سے کماحقہٗ متمتع نہیں ہو پاتا بلکہ اسے اکارت کر دیتا ہے۔

شراب کو سنسکرت میں مَد یا مَدرا کہتے ہیں جس کی مناسبت سے یہ ضرب المثل مشہور ہے کہ " مَد آئی، مَت گئی۔ "انگریزی میں اسے (Wine) کہتے ہیں جس کی قسموں میں بیئر، وہسکی اور کاک ٹیل مشہور ہیں۔ فارسی میں اسے مَے، آبِ جو، دارو، بادہ، اور دختِ رز یعنی انگور کی بیٹی کہتے ہیں۔ اہلِ فارس نے اسے طرح طرح کے نام دے کر اس کی جا و بے جا تعریف و توصیف کے پل باندھے ہیں مثلاً شرابِ سرخ، شرابِ کہنہ، شرابِ تیز، شرابِ عشق، شرابِ معرفت وغیرہ۔ پنجاب میں یہ لال پانی کے نام سے مشہور ہے اور سکھ اسے دارو کہتے ہیں۔ مگر شراب کی سب سے

Marfat.com

اعلیٰ، پاک اور منزہ قسم شرابِ طہور ہے جو صرف اہلِ جنت کا مشروب ہے۔

شراب کے لوازمات کا سب سے پہلا اور اہم لازمہ یہ ہے کہ اس میں تھوڑا سا پانی یا سوڈا واٹر ملا کر پیتے ہیں تا کہ اس کی تیزی و تلخی نارمل رہے۔ خالی پیٹ نہیں پیتے۔ پینے کے بعد منہ کا ذائقہ بدلنے کے لئے کوئی میٹھی چیز ضرور کھاتے ہیں جسے فارسی میں نُقل کہتے ہیں تا کہ اس کی بو باس معدوم رہے۔ اہلِ فارس جو امرد پرستی کے دلدادہ ہیں اکثر مغ بچوں کے ہاتھوں سے پینے کو ترجیح دیتے ہیں۔

شراب چھپ چھپا کر پی جاتی ہے۔ اکیلے میں پی جاتی ہے اور مل جل کر بھی حلقہ میں بیٹھ کر شراب کا دور چلتا ہے اور خوشی کی تقریبات میں الگ محفلیں برپا کی جاتی ہیں۔ مے نوش اس کے پینے کے آداب کو ہمیشہ ملحوظ رکھتے ہیں۔ پینے سے پہلے بوتل سے چند قطرے زمین پر گرا کر اس کی زکوٰۃ نکالتے ہیں۔ تھوڑی تھوڑی اور گھونٹ گھونٹ کر کے پیتے ہیں۔ فرطِ نشاط میں جام سے جام ٹکرا کر پیتے ہیں اور کاک ٹیل کے استعمال کے بعد بلوریں جام زمین پر پھینک کر توڑتے ہیں اور ان کی چھنا چھن میں سرور و مستی کے عالم میں جھولتے ہوئے رقص کرتے ہیں۔ شراب کے ساتھ ساتھ گوشت خوری کا ضرور اہتمام کرتے ہیں۔

بعض اسے محض غم غلط کرنے کا ذریعہ سمجھ سمجھا کر جواز پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ شراب رنج و غم کو بھلا دیتی ہے مگر میں کہتا ہوں کہ یہ رنج و آلام کو مٹانے کے بجائے اس کی آگ کو اور ہوا دیتی ہے۔ جنگجو اسے میدانِ کارزار میں جوہر دکھانے کا باعث قرار دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ بعض ادباء و شعراء بھی اسے کیف و سرور کا ذریعہ خیال کرتے ہیں اور اسے فکر و تصوّر کی بلند پروازی کا سبب سمجھتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اس سے تخئیل کو مہمیز ملتی ہے اور مضمون ہائے عنقا ہاتھ آتے ہیں۔ غرض انہوں نے طرح طرح کے اور اپنے اپنے انداز میں اس کے جواز تراشے ہیں۔ مثال کے طور پر میں غالب کے نظریہ پر اکتفا کرتا ہوں کہ

مے سے غرض نشاط ہے کس رو سیاہ کو
اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیئے

شراب کو بطور دوا بھی استعمال کیا جاتا ہے مسکّن ادویات کا یہ جزو لاینفک ہے۔ زخموں پر بھی لگاتے ہیں۔ شدید درد کے دفعیہ کے لئے بھی تجویز کی جاتی ہے اور یہاں تک کہ سانس کے مریض

Marfat.com

کو، کان، پسلی اور نمونیہ کے درد کے علاوہ دردِ زہ اور زچگی کے عالم میں بھی اس کے دو گھونٹ نافع سمجھے جاتے ہیں مگر افسوس کہ ہم یہ نہیں جانتے کہ اس کے استعمال سے جسم پھول کر کپا لگنے لگتا ہے۔ یہ گلے اور معدہ کو خراب کرتی ہے۔ سینے کو جلاتی اور پھیپھڑوں کو تباہ کر دیتی ہے اور حواس کو مختل کر دیتی ہے اور شرابی بدحواسی کے عالم میں واہی تباہی بکنے لگتا ہے اور بیوی اور بہن کے امتیاز سے بھی قاصر ہو جاتا ہے۔

من موجی اور عشق منش حضرات عالم شباب میں شراب کی دلدادگی کیساتھ ساتھ جنسی ہوس پرستی کے لئے جنسِ لطیف کی معیّت کے متمنی ہوتے ہیں اور رقص و سرور کی محافلِ عیش و نشاط میں اسی کی گلگونی سے رنگینی پیدا ہوتی ہے۔ گونا گوں گل کھلتے ہیں۔

شراب نوشی کی ابتدا شوق یا حلقۂ احباب کے اثر سے ہوتی ہے یا مفت کی پیتے پیتے اس کی لت پڑ جاتی ہے اور بڑھتے بڑھتے یہ عادت ثانیہ بن جاتی ہے اور آدمی اس کا اتنا رسیا بن جاتا ہے کہ بن پیئے رہ نہیں سکتا اور پھر اگر وہ چاہے بھی تو لاکھ کوشش کے باوجود اسے ترک نہیں کر سکتا جیسا کہ بزبانِ شاعر سنتے ہیں کہ

چھٹتی نہیں ہے کافر یہ منہ سے لگی ہوئی

یا

پوپلے ہوگئے جناب شیخ
دختر رز پہ ہے دانت اب تک

مگر اِلّا ماشاءاللہ۔

شراب بیچنے اور پینے پر پابندی کے ساتھ ساتھ مے فروشی اور مے نوشی کے پرمٹ جاری کرنے کی حکومتی پالیسی کا تضاد عقل سے ماورا ہے۔ کیا یہ ایک اسلامی اور فلاحی مملکت کو زیب دیتا ہے؟

بس میرا تو یہی مشورہ ہے کہ شراب کو ہاتھ لگایئے نہ منہ۔ جوانی کو غنیمت جانیئے اسے لنگوٹ باندھ کر سنبھالیئے اور اس سے بھرپور فائدہ اٹھایئے۔ افعالِ قبیحہ سے بچیئے اور اسے بیہودگی میں ضائع نہ کیجئے تاکہ حسرت اور پچھتاوے کا احساس نہ رہے۔ سادگی اور پاکیزگی سے نیکی اور پاکبازی کا شیوہ اپنایئے۔ یہ جوانمردی ہے کہ اپنی صلاحیتوں کو ملک و قوم کے لئے وقف کر کے

Marfat.com

کارہائے نمایاں سرانجام دے کر نیک نام حاصل کیجئے۔ بزبانِ شاعر یہی جواں مردی ہے کہ

در جوانی توبہ کردن شیوۂ پیغمبری
وقت پیری گرگ ظالم میشود پرہیزگار

شراب کے اس ذکر کو آپ ازراہِ کرم میرے ذاتی تجربات پر ہرگز محمول نہ کریں۔ اسے صرف اور صرف شنیدات اور کچھ حد تک مشاہدات پر مبنی قرار دیجیئے کیونکہ میں جانتا ہوں اور آپ سے بھی کہنا چاہتا ہوں کہ شراب شراب ہی ہے۔ حرام اور قطعاً حرام ہے۔ اس میں ہرگز ہرگز شفا نہیں ہے۔ یہ جرائم اور بداعمالیوں کی جڑ ہے۔ اس کا بنانا، بیچنا اور استعمال کرنا سب حرام ہیں۔ یہ جسم کے لئے ہرگز مفید نہیں ہے۔ یہ دل و دماغ کی صلاحیتوں کو بالکل اجاگر نہیں کرتی بلکہ حواس خمسہ کو سلب کرتی ہے۔ یہ سراسر تباہی اور بربادی کا پیش خیمہ ہے اس سے کوئی ذہنی دماغی، جسمانی یا اخلاقی فائدہ نہیں پہنچتا اور اس مثل کو بھی کبھی فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ "شراب خوار ہمیشہ خوار" یعنی شرابی ہمیشہ ذلیل و خوار ہوتا ہے۔ ہم نے تو ہمیشہ یہی پیغام سنا اور دیا ہے کہ

مت پیو شراب، خانہ کرتی ہے خراب
عقل دیتی ہے جواب، یہ سچائی ہے

Marfat.com

شرینی اور شیریں

شرینی اسم عام ہے اور شیریں اسم صفت۔ معنی کے لحاظ سے شرینی مٹھاس، حلاوت اور مٹھائی کو کہتے ہیں اور شیریں شرینی کی مناسبت سے مٹھاس سے بھرا یعنی میٹھا/میٹھی کا مفہوم ظاہر کرتا ہے۔ دونوں میں مٹھاس کی خوبی قدر مشترک ہے مگر یاد رہے کہ شرینی اور شیریں کو شیر یا شیرے سے کوئی نسبت نہیں ہے البتہ شیرہ سے اس کا دور سے رشتہ قائم کیا جاسکتا ہے جو قوام اور چاشنی کے معنی دیتا ہے اور باداموں، انگوروں اور کھجوروں کو پیس کر نکالا جاتا ہے۔

شرینی بنائی اور بیچی جاتی ہے۔ کھائی بھی جاتی ہے اور کھلائی بھی جاتی ہے۔ بانٹی اور تقسیم بھی کی جاتی ہے۔ بچے بڑی رغبت اور شوق سے کھاتے ہیں۔ عورتیں کھٹائی کی شوقین ہوتی ہیں اور کھٹی میٹھی چیزوں کے ساتھ ساتھ میٹھی چیزوں کا بھی عام استعمال کرتی ہیں مگر پنجابی کا یہ مقولہ "مرد مٹھیائی بُری، عورت کھٹیائی بُری" کا مقصد صرف اتنا ہے کہ مٹھائی اور کھٹائی کی لت بُری ہے۔ عورتیں (بالخصوص) خوشی کے موقعوں پر شرینی کا تبادلہ اور تقسیم ضروری سمجھتی ہیں ورنہ خوشی پھیکی متصوّر ہوتی ہے کیونکہ خوشی کے موقعہ پر منہ میٹھا کرنا، کرانا اور شکرانۂ نعمت کی ادائیگی کے لئے شرینی تقسیم کرنا خوشی کے اظہار کی اوّلین علامت سمجھی جاتی ہیں۔

عیدالفطر کو میٹھی عید کہتے ہیں کیونکہ اس تہوار پر کھانے کے لئے میٹھی چیزوں (سویاں اور حلوہ وغیرہ) کا بطور خاص اہتمام کیا جاتا ہے اور مٹھائی اور میٹھی چیزوں کے تحفوں کا باہم تبادلہ کیا جاتا ہے مگر عیدالاضحیٰ (جسے نمکین عید بھی کہتے ہیں) پر نمکین گوشت وغیرہ کھانے کے بعد کام و دہن کے ذائقہ کو بدلنے کے لئے بھی مٹھائی کا استعمال لازم سمجھا جاتا ہے مگر ذیابیطس کے مریضوں کو ہر دم اس سے پرہیز کرنا چاہیئے۔

شرینی اور شیریں چیزیں یعنی مٹھائی اور میٹھی چیزیں شکر، گڑ یا چینی سے بنتی ہیں (جو اصلی اور خالص ہوتی ہیں) جنہیں مختلف اور میٹھے میٹھے ناموں سے موسوم کیا جاتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ منافع خور حلوائی چینی کی جگہ سکرین (Saccharine) استعمال کرتے ہیں جو

Marfat.com

کھانڈ سے ساڑھے پانسو گنا زیادہ میٹھی ہوتی ہے۔قفلیوں اور مشروبات میں تو سکیرین کا استعمال عام ہوتا ہے۔

شکر اور گڑ، گنے کے رس سے بناتے ہیں اور کیمیکل کے آمیزہ سے اسے سفید کر کے چینی تیار کی جاتی ہے۔چینی کو سفید شکر بھی کہتے ہیں۔ چقندر اور آلو وغیرہ سے بھی چینی تیار کی جاتی ہے۔ چھوہارے، بتاشے، مکھانے وغیرہ بھی مٹھائیوں میں شمار ہوتے ہیں۔آج کل تو بچوں کے لئے بے شمار قسم کی مٹھائیاں (Sweets) دستیاب ہیں جنہیں عجیب وغریب اور دلکش نام دیے جاتے ہیں۔ یہ دھڑا دھڑ بنتی، بکتی اور کھائی جاتی ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ان سے بچوں کے دانت اور معدے متاثر ہوتے ہیں اور حکیموں ڈاکٹروں کی مناہی ہدایات کے باوجود ان کا استعمال مقبول عام کی سند حاصل کئے ہوئے ہے۔

بلاشبہ شرینی بے حد مرغوب اور پسندیدہ شئے ہے۔اس کی رغبت اور پسندیدگی کے اظہار کے لئے تو یہ کہاوت تک گھڑی گئی ہے کہ " گڑ خدا تعالیٰ کے پاس بھی گیا تھا تو اس نے بھی اسے کھانے سے انکار نہیں کیا تھا"

شرینی کے یہ اوصاف جب کوئی محبوب اپنی اداؤں میں شامل کر لیتا ہے تو اس کی چال ڈھال، گفتگو کا لب ولہجہ، لب ودہن اور ناز وانداز غرض اس کا سب کچھ شیریں ہو جاتا ہے۔وہ شیریں چال، شیریں شمائل، شیریں خصال، شیریں ادا اور شیریں لب کی صفات سے متصف گردانا جاتا ہے۔اس کی شیریں لبی کے کمال کا نمونہ غالب کی زبان سے سنیئے:

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب
گالیاں کھا کے بھی بد مزا نہ ہوا

مگر

شیرینی کی یہ صفات جب کلام میں گھل مل جاتی ہیں تو سونے پر سہاگے کا کام دیتی ہیں۔ کلام پیارا اور پُر تاثیر بن جاتا ہے۔ بات چیت، گفتگو، مکالمہ بازی، فقرہ بازی، جملہ سازی اور شعر گوئی میں شیرینی کے ساتھ ساتھ حلاوت بھی در آتی ہے اور صاحب کلام، خطیب وواعظ اور ادیب وشاعر شیریں کلام، شیریں بیان، شیریں زبان اور شیریں سخن کے لقب سے ملقب ہو جاتے ہیں اور ان کی شگفتہ وشیریں تحریروں اور تقریروں سے ہر کہ ومہ اور پیر وبرنا سامع

Marfat.com

اور قاری لطف اندوز ہوتا ہے۔ مگر اس کے باوصف بچوں کی پیاری پیاری، بھولی بھالی اور میٹھی میٹھی باتوں میں خود نکلتی ہوئی صداقت اور معصومیت کی جو شیرینی پائی جاتی ہے وہ بڑی لاجواب اور بے مثل ہے۔ ان کی شیریں کلامی کی لطف انگیزی اور تاثیر پذیری کے مقابلے میں کوئی کلام نہیں۔

مہر و محبت کی داستانوں میں شیریں فرہاد کی ایک مشہور داستان ہے جس کے طالب و مطلوب کا عشق سچا تھا مگر عاشق و معشوق دونوں ایک جھوٹ کی بھینٹ چڑھ گئے اور بے موت مر کر امر ہو گئے۔ فرہاد کی معشوقہ شیریں حُسن و جمال کا مجسمہ اور وفا کا پیکر تھی۔ وہ بے حد خوبصورت اور بہت پیاری تھی اور اس پر طرہ یہ کہ نام بھی نہایت حسین، میٹھا اور پیارا یعنی "شیریں" تھا گویا وہ اسم بامسمّٰی تھی یعنی شیریں شمائل، شیریں دہن، شیریں لب، شیریں چال اور شیریں ادا تھی۔ شیریں کی اتنی صفات کی بنا پر اکثر والدین اپنی بیٹیوں کا نام شیریں رکھتے ہیں مگر بمصداق "چہ نسبت خاک را بہ عالم پاک" وہ شیریں وہی شیریں تھی اور کوئی شیریں اس شیریں کی سی نہیں ہو سکتی۔

شرینی اور شیریں کی بات ختم کرتے ہوئے میں یہ ذہن نشین کروانا چاہتا ہوں کہ شرینی کم استعمال کیجئے کیونکہ اس کا زیادہ استعمال مضر ہے اور فرہاد کی شیریں بننے کی بھی کوشش نہ کیجئے کیونکہ یہ ناممکن ہے۔ مگر

اپنے کلام میں ضرور شرینی بھرنے کی کوشش کر کے شیریں کلام کہلانے کی سعادت حاصل کیجئے اسی میں مقبولیت، پسندیدگی اور شہرت و ناموری کا راز مضمر ہے اور یہ بھی یاد رکھیئے کہ "لڑائی میں شرینی نہیں بٹتی"۔

Marfat.com

ضرورت اور ایجاد

ضرورت احتیاج اور حاجت کو کہتے ہیں جبکہ ایجاد اختراع یعنی کسی نئی چیز کو پیدا کرنے یا بنانے کے معنی دیتا ہے اور جب کوئی شخص اپنی ایجاد کردہ چیز کو پیش کرتا ہے تو وہ انکسار سے کام لیتے ہوئے فارسی کی اس مثل ''ایجادِ بندہ اگرچہ گندہ'' کا سہارا لے کر اسے متعارف کرانے کی کوشش کرتا ہے۔

ضرورت اور ایجاد میں فرق یہ ہے کہ ضرورت ہوتی ہے، رہتی ہے اور گاہ گاہے آن پڑتی ہے مگر ایجاد کی جاتی ہے اور جب وہ ہو جاتی ہے تو ضرورت بھی بن جاتی ہے۔ ضرورت لازمی اور ضروری ہوتی ہے جسے بالضرور پورا کرنا پڑتا ہے جبکہ ایجاد لازم اور ضروری نہیں ہے مگر یہ اور بات ہے کہ مختلف النوع ضروریات کو پورا کرنے کے لئے مختلف راہیں کھولنا اور نئی جہتیں متعین کرنا پڑتی ہیں جو انسان کو ایجادات کی طرف متوجہ کرتی ہیں۔

ضرورت اور ایجاد کے ملاپ سے اُردو والوں نے ایک بڑی خوبصورت مثل وضع کر رکھی ہے کہ "ضرورت ایجاد کی ماں ہے" مگر بعض کا خیال ہے کہ یہ مثل انگریزی مثل Necessity is the mother of invention کا ترجمہ ہے جو "پیاسا کوّا" یا "دانا کوّا" کی خود ساختہ کہانی سے اخذ شدہ ہے۔ بلاشبہ کوّا ایک ذہین پرندہ سمجھا جاتا ہے مگر کہانی کے مطابق اس کی پیاس بجھانے کی منصوبہ سازی سے اس کی ذہانت کے اظہار کا کوئی جواز دکھائی نہیں دیتا۔ اگر وہ ڈھوروں کے مرنے یا ڈھولوں کے پھاڑنے کی کوئی ترکیب نکالتا تو اس کی ذہانت کا سکہ قائم ہو سکتا تھا تاہم ہابیل کو قابیل کے قتل پر اس کی لاش کو ٹھکانے لگانے کے لئے جو کام اس نے کیا تھا وہ تاریخی حوالے سے یقیناً اس کی ذہانت کی واضح دلیل ہے۔

رہی یہ بات کہ یہ مثل اہلِ اُردو کی اختراع ہے یا انگریزوں کی تو اس ضمن میں آج تک کوئی تحقیق منظرِ عام پر نہیں آئی کہ اس کی اولیّت کا سہرا کس کے سر ہے یا کس نے کس سے یہ مثل چرائی ہے۔ میرے خیال میں اسے ایک دوسرے کے متبادل یا ہم معنی سمجھ کر تحقیق کے لئے مغز ماری کی

Marfat.com

کوئی ضرورت نہیں۔اگر آپ تحقیق کی سعی کریں بھی تو کیا ثابت کر پائیں گے؟ کیا ضرورت واقعی ایجاد کی ماں ہے یا نہیں؟ دونوں صورتوں میں کچھ لوگ آپ سے اتفاق کریں گے اور کچھ انکار۔آخر فائدہ کیا؟ اگر آپ ضرورت کو ایجاد کی ماں مان بھی لیں تو آپ اس کا باپ کسے تسلیم کریں گے؟ کیونکہ بن باپ کے کوئی ماں کسی کو جنم نہیں دے سکتی۔میرے اس خیال سے یہ نتیجہ ہرگز نہ نکالیں کہ میں امثال اور مقولوں پر یقین نہیں رکھتا۔میں جانتا ہوں کہ مقولے اور مثالیں دانشوروں کے تجربات ومشاہدات کا نچوڑ ہوتی ہیں مگر میرے کہنے کا مطلب صرف اتنا ہے کہ ہر مثال اور ہر مقولے کو بلا سمجھے پرکھے اور آنکھیں بند کر کے صحیح مان لینے کی آخر ضرورت کیوں ہے؟ کیا اس مثال میں الفاظ کی کوئی تبدیلی نہیں لائی جا سکتی؟

اس دلیل پر ذرا غور فرمایئے کہ بقائے حیات کے لئے خوراک کی ضرورت ہے جس کے حصول کے لئے وسائل کو بروئے کار لانے کی ضرورت ہے نہ کہ ماں کی تلاش۔میرے نزدیک ضرورت ایک مجبوری ہے جس کے لئے برداشت کی ضرورت ہے اور ضرورت کی تکمیل کے لئے ہمت کی ضرورت ہے سہارے کی نہیں مگر یہ اور بات ہے کہ جب کوئی ایجاد عام ہو جاتی تو وہ ضرورت بن جاتی ہے اور اس سے حاصل سہولت کو ایک نعمت سمجھا جاتا ہے۔دور نہ جایئے ایک ٹیلیفون کی ایجاد کی مثال کو ہی لے لیجئے۔کبھی وقت تھا کہ پیغام رسانی کے لئے پیادوں، خطوط یا ٹیلیگراف کا سہارا لیا جاتا تھا جس میں دوری بہت بڑی رکاوٹ تھی اور وقت بھی خاصا درکار ہوتا تھا مگر آج ٹیلیفون کی سہولت نے سب فاصلے مٹا دیئے ہیں اور وقت بھی ضائع نہیں ہوتا۔اس سے بالمشافہ نہ سہی مگر باہم بات چیت ممکن ہوگئی ہے۔اُمید ہے کہ آپ اس مثال سے بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں کہ تفوق کس کو حاصل ہے؟ ضرورت کو یا ایجاد کو؟ _____ ضرورت کو ایجاد کی ماں سمجھا جائے یا ایجاد کو ضرورت کی ماں جو انسانوں کے آرام اور سہولت کا نہ صرف خیال رکھتی ہے بلکہ سامان بھی مہیا کرتی ہے۔اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ ضرورت ایجاد کے بعد پیدا ہوتی ہے یوں "ضرورت ایجاد کی ماں ہے" کی مثل صادق نہیں بلکہ کاذب دکھائی دیتی ہے۔

اسی طرح "اونٹ کی کہانی" سے یہ مثل وضع کی گئی ہے کہ " کھڑا ہونے کی جگہ تم دبدو بیٹھنے کی میں خود کر لوں گا" اس میں اجازت کا پہلو محل نظر ہے جس میں دعویٰ کی تکمیل وتصدیق کے لئے اس کی (اجازت) ضرورت ہے مگر نتائج کو پیش نظر رکھتے ہوئے ذہن اس امر کی اجازت کیسے

Marfat.com

دے سکتا ہے؟

بمثل "چڑی چونچ بھر لے گئی مول نہ گھٹیا نیر" عقل یہ کیسے تسلیم کرے کہ وافر مقدار میں سے چاہے تھوڑی سی چیز ہی کیوں نہ لی جائے، تو کل مقدار میں کمی کیسے واقع نہ ہوگی؟ یا

بمثل ''چھکا ٹوٹا بلّی کے بھاگوں'' یہ کیسے باور کیا جا سکتا ہے کہ بھاگ (مقدّر) اتفاقات کے مرہونِ منّت ہیں یہ تو نوشتۂ تقدیر ہیں اور یہ جو کہا جاتا ہے کہ ''ضرورت سب کچھ کرا لیتی ہے'' اسے اگر سچ مان بھی لیا جائے تو نیک نامی یا بدنامی کا خیال کیوں پیشِ نظر نہیں رکھا جاتا؟ یا ''ضرورت کے وقت گدھے کو باپ بنا لیتے ہیں'' کی صداقت کا تصوّر تک عقل وذہانت سے بھید ہے کیونکہ کسی کو یونہی باپ بنا لینا یا کہہ دینا گالی سے کم نہیں۔ البتہ ''ضرورت'' کا محاوراتی استعمال بالکل جائز ہے کیونکہ محاورہ ہمیشہ مجازی یعنی غیر حقیقی معنوں میں استعمال ہوتا ہے جیسے :ضرورت ماری جانا۔ ضرورت میں کام آنا۔ ضرورت سے فارغ ہونا وغیرہ مگر ''ضرورت'' تنہا حقیقی اور اصلی معنوں میں استعمال نہ کرنا علم ودانش کی کمی ہے مگر اس حقیقت سے کسی کو انکار نہیں کہ ایجادِ علم ودانش کی بدولت معرضِ وجود میں آتی ہے اور تجربات کا نچوڑ ہوتی ہے۔ لہٰذا میں یہ کہتے ہوئے ذرا بھی باک محسوس نہیں کرتا کہ ''ضرورت ایجاد کی ماں نہیں'' اور اگر آپ ضرورت کو ایجاد کی ماں ہی سمجھنے پر مصر ہیں تو پھر علم کو ایجاد کا باپ اور دانش کو اس کی ماں سمجھنے کا تجربہ کرنا ہوگا۔ آگے آپ کی مرضی۔

Marfat.com

طاقت اور قوّت

طاقت اور قوّت دونوں عربی کے الفاظ ہیں جو مونث اور مترادف ہیں اور اُردو فارسی میں بھی بعینہٖ مستعمل ہیں۔ یہ الفاظ زور، بل، توانائی، سکت، حوصلہ، مجال، حیثیت اور مقدور کے علاوہ حکومت وسلطنت کے معنوں میں بھی استعمال ہوتے ہیں۔ یاد رہے کہ جدید تحقیق کے مطابق یہ طے شدہ امر ہے کہ تمام انسانی طاقتوں اور قوتوں کا سرچشمہ جسم نہیں بلکہ دماغ ہے۔

کہتے ہیں کہ جس میں طاقت ہوتی ہے وہی طاقتور کہلاتا ہے چاہے وہ طاقت جسمانی ہو، ذہنی یا روحانی اور وہ طاقتوری کی بدولت ہی ہر میدان (چاہے وہ کُشتی کا ہو، کھیل کا ہو، سیاست کا ہو، وکالت کا ہو، دلالت کا ہو _____ کوئی بھی ہو) کو فتح کرتا ہے لیکن جب اس کی طاقت سلب ہو جاتی ہے یا جواب دے دیتی ہے تو وہ بے طاقت ہو کر بے بس اور بے کار ہو کر رہ جاتا ہے اور اس کے سب کس بل نکل جاتے ہیں۔

انگریزی زبان میں طاقت کا متبادل لفظ پاور (Power) ہے جو یونانی زبان کے لفظ POTERE سے لیا گیا ہے جس کا مطلب ہے: ''کسی کام کو کرنے کے قابل ہونا'' طاقت کا کمال یہ ہے کہ وہ ہمارے لئے مواقع پیدا کرتی ہے جن سے فائدہ اٹھا کر ہم کامیاب زندگی گزارنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ اندرونی خوشی اور سکون محسوس کرتے ہیں اور ہمارے اندر خود اعتمادی کا احساس جاگزیں ہوتا ہے مگر کم ظرف خودی اور خود پسندی کا شکار ہو جاتے ہیں اور معمولی سے معمولی معاملہ کو بھی زندگی اور موت کا مسئلہ بنا لیتے ہیں اور شہرت کے بجائے بدنامی کما لیتے ہیں۔

طاقت کی کئی قسمیں ہیں۔ مثلاً

1- **جسمانی طاقت:** جرأت، ہمت اور حوصلہ عطا کرتی ہے۔ اس سے انسان دوسروں کو زیر کرتا ہے۔

2- **مالی طاقت:** حرص، لالچ اور سہل پسندی کا باعث ہے۔ اس سے انسان دوسروں کو

Marfat.com

خریدتا ہے۔

3- جذباتی/طاقت: خودغرضانہ خواہشات کوجنم دیتی ہے مگر اسکا ایک فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ انسان نامساعد حالات ومشکلات کا بخوبی مقابلہ کرنے کے قابل ہوجاتے ہیں۔

4- نفسانی طاقت: جنسی خواہشات کی بالخصوص متقاضی ہوتی ہے جو جسمانی تسکین کی متمنی ہوتی ہے۔

5- روحانی طاقت: خداداد کوالٹی ہے نظریات پر مبنی ہوتی ہے۔ یہ ضبطِ نفس اور شعوروآگہی کی اہلیت عطا کرتی ہے اور یہ پیش بینی اور پیش گوئی کے معجز نما کمالات کی مظہر بھی ہوتی ہے۔

6- علمی طاقت: محنت وکوشش سے حاصل ہوتی ہے جس سے ذہنی شکتی حاصل ہوتی ہے۔ تجربات ومشاہدات اسے جلا بخشتے ہیں۔اس کی بدولت تبلیغ واشاعت کے موثر نتائج برآمد ہوتے ہی۔

طاقت کی اقسام اوران کے تمام تر محاسن ومعائب کے باوصف یہ امر مسلّم ہے کہ طاقت چاہے کیسی بھی کیوں نہ ہواس کا متوازن ہونا بے حد ضروری ہے تا کہ وہ قابو میں رہ سکے اوراس کے منفی اثرات مرتب نہ ہوں۔

طاقت کے مقابلہ میں قوت کا لفظ کثرت سے استعمال ہوتا ہے۔اس سے بے شمار مرکبات بنتے ہیں جن کو اقسام ذیل میں منقسم کیا جاسکتا ہے:

1- جسمانی: جیسے قوّتِ معدہ۔قوّتِ ہاضمہ۔قوّتِ بازو۔قوّتِ باہ۔قوّتِ باصرہ۔قوّتِ ذائقہ۔قوّتِ لامسہ۔قوّتِ سامعہ۔قوّتِ شامّہ۔قوّتِ ماسکہ۔قوّتِ مولّدہ۔قوّتِ نامیہ۔قوّتِ شہوانیہ۔

2- قلبی وذہنی: قوّتِ ارادی،قوّتِ فکر،قوّتِ حافظہ،قوّتِ خیال،قوّتِ متخیلہ،قوّتِ متصوّرہ،قوّتِ متفکّرہ،قوّتِ ممیّزہ،قوّتِ واہمہ،قوّتِ متصرّفہ،قوّتِ روحانی

Marfat.com

3- سائنسی: قوّتِ ثقل۔قوّتِ محرکہ۔قوّتِ مدرکہ۔قوّتِ جاذبہ۔

4- معاشرتی: اخلاقی ۔قانونی۔دینی۔انفرادی۔اجتماعی۔عوامی۔سیاسی۔اقتصادی۔ جمہوری۔سفارتی۔عسکری۔اختیاری۔

قوت کی جمع قوا/قویٰ ہے۔اس مناسبت سے ان کی تقسیم یوں کی جاتی ہے:

1- قوائے انسانی: یعنی انسان کی تمام قوّتیں۔

2- قوائے حیوانی: یعنی وہ قوّتیں جو انسانوں اور حیوانوں دونوں میں پائی جاتی ہیں جن کے متعلق خیال کیا جاتا ہے کہ ان کا تعلق دل سے ہوتا ہے جیسے خوشی، غم،رنج،غصہ،محبت وغیرہ مگر جدید تحقیقات نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ہر قوّت کا تعلق صرف دماغ سے ہے اور دل صرف خون کو پمپ کرتا ہے۔

3- قوائے طبعی: یعنی وہ قوّتیں جو جگر سے تعلّق رکھتی ہیں جیسے: ہاضمہ،مولّدہ،نامیہ،جاذبہ، ماسکہ۔

4- قوائے نفسانی: یعنی وہ قوّتیں جو دماغ سے تعلق رکھتی ہیں۔جیسے: باصرہ،سامعہ،شامّہ،ذائقہ، حس مشترک خیال،متفکّرہ،حافظہ،واہمہ۔

5- قوائے قدر و جبر: سلطانی اور حکمرانی۔

6- قوائے سفلی: شیطانی اور جادوئی۔

7- قوائے حسنہ: قوّتِ قلب ونظر۔قوّتِ فقر وغنا۔قوّتِ صبر ورضا۔قوّتِ جود وسخا۔

قوّت اور طاقت کی اقسام اور ان کی خصوصیات کے باوصف حقیقی امر یہی ہے کہ قوّت و طاقت کا صحیح مصرف کیا جائے۔ان سے جائز طبعی اور نفسانی کام لئے جائیں اور ان کے غلط اور بے جا استعمال سے پرہیز کیا جائے۔ان ی تمام تر صلاحیتوں کی ذاتی اور بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود کے لئے بروئے کار لایا جائے اور ان کے صرفِ بے جا سے مختلف قسم کی الجھنوں اور مسائل کا خود شکار ہونے یا دوسروں کو ان کے مضر اثرات سے متاثر ہونے سے بچایا جائے۔

یوں تو ہر قوّت کے دو رخ ہوتے ہیں مگر شخصی (انفرادی) قوّتِ کے مثبت اور منفی پہلوؤں

Marfat.com

کے نتائج کا اگر عالمی سطح پر جائزہ لیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ شخصی قوت اکثر آمریت پیدا کرتی ہے جو نظامِ سلطنت کو تہس نہس کر دیتی ہے اور بدامنی، افراتفری اور کشت وخون کی داستانیں رقم کرتی ہے لیکن تاریخِ عالم بعض ایسی عظیم ہستیوں کے ناموں سے بھری پڑی ہے جنہوں نے تن تنہا عظیم روایات قائم ہیں۔ انبیاء واولیاء نے تائیدِ ایزدی اور عشق الٰہی کی بدولت جو مثالی اور قابلِ تقلید روایات قائم ہیں ان کا تذکرہ کیا کرنا لیکن سیاسی اور سماجی میدانوں میں جن ہستیوں نے کارہائے نمایاں سرانجام دیے ہیں وہ ان کی شخصی قوت اور قوت ارادی کی منہ بولتی تصویریں ہیں ان عظیم اشخاص میں نیلسن منڈیلہ، یاسر عرفات، شیخ زید بن سلطان النہیان، مدر ٹریسا، سر گنگارام، دیال سنگھ، عبدالستار ایدھی، انصار برنی، عمران خان اور ابرارالحق کے نام بطور حوالہ پیش کرنے پر اکتفا کرتا ہوں جنہوں نے نسلِ انسانی کے لئے ایسے کارنامے سرانجام دیے ہیں جو قابلِ داد وتحسین ہیں۔ آیئے ان کے کارواں میں شامل ہو کر ہم بھی بنی نوع انسان کی بھلائی کے لئے اپنی تمام تر قوتیں اور صلاحیتیں وقف کرنے کا عزم لے کر سرگرم عمل ہو جائیں۔

قوت وطاقت کی اس مبحث سے جو نتائج اخذ ہوتے ہیں وہ کچھ یوں بیان کئے جاسکتے ہیں کہ

۱) حصولِ مقصد کے لئے قوتِ ارادی بنیادی ضرورت ہے جس سے انسان قوت پذیر ہوتا ہے اور اسی کی بدولت اس کی تمام کوششیں اور کاوشیں بارآور ہو کر اسے کامیابی وکامرانی سے ہمکنار کرتی ہیں۔ یہاں یاد رہے کہ کوئی بھی چیز انسانی طاقت سے ماورا نہیں ماسوائے اس کے کہ موت وحیات اس کے اختیار میں نہیں مگر یہ اور بات ہے کہ حالات ووسائل کی نامساعدت کے باعث قوتِ بسری کا قوتِ لایموت کے لئے اپنی تمام تر قوتوں اور کوششوں کو بروئے کار لانے کے باوجود اس کی ساری زندگی عسرت وتنگدستی میں گزر جاتی ہے۔

۲) اقتصادی قوت عوام اور حکومت کی خوشحالی کی ضامن ہوتی ہے۔

۳) سیاسی اور سفارتی قوت جمہوریت کو استحکام بخشتی ہے۔

۴) اقتدار کے ساتھ سنگھاسن پر براجمان رہنے کے لئے گروہی/جماعتی قوت درکار ہوتی ہے۔

۵) ملک کی سلامتی، تحفظ اور بقا کے لئے عسکری قوت بے حد ضروری ہے۔

۶) دنیاوی خواہشات کی تکمیل کے لئے ذہنی اور جسمانی قوت درکار ہوتی ہے جبکہ اخروی آسودگی کے لئے روحانی قوت کام آتی ہے۔

Marfat.com

غلطی اور توبہ

غلطی سہو، خطا اور نا سمجھی کا فعل ہے اور توبہ کسی بُرے کام سے باز رہنے کا عہد ہے۔ غلطی بھول چوک کا نام ہے یہ ایک ایسا کام ہے جسے انسان کی فطری کمزوری سے تعبیر کیا جاتا ہے اس لئے اس کا مرتکب قابلِ معافی ہے اور از خود اپنی بھول کا اعتراف تسکین قلب کا باعث ہوتا ہے بشرطیکہ اس کے دوبارہ نہ کرنے کا عہد کر لیا جائے۔ یہی توبہ ہے۔

بمصداق "الاِنسَانَ مُرَکّبُ الْخَطَاءُ وَالْنِسْیَان "(انسان سہو و خطا کا پُتلا ہے) ہمارا یہ ایمان بھی ہے کہ

"To error is human and forgive is Devine"

(خطا کام انسان کا اور بخشش کام رحمان کا)

غلطی نادانی میں سرزد ہوتی ہے مگر دانستہ کئے جانے والا فعل غلطی نہیں بلکہ جرم متصوّر ہوتا ہے اور قابلِ تعزیر قرار دیا جاتا ہے غلطی کی مختلف صورتیں ہیں:

چھوٹی بڑی غلطی، معمولی وغیرہ مگر فاش غلطی سب سے زیادہ تکلیف دہ اور خطرناک ہوتی ہے۔ اس سے اجتناب بہتر ہے مگر اس کا کیا کیا جائے کہ غلطی بھولے میں ہو ہی جاتی ہے۔ غلط فہمی، غلط بیانی اور غلط گوئی کا شمار بھی غلطی میں ہی ہوتا ہے۔

انسان سے غلطی ہوتی ہے اور وہ غلطی سے کچھ نہ کچھ غلط کر بیٹھتا ہے۔ وہ غلطی کھاتا بھی ہے اور غلطی میں پڑ بھی جاتا ہے مگر دوسروں میں غلطی نکالنا اور ان کی غلطی پکڑنا اس کی سب سے بڑی غلطی سمجھی جاتی ہے۔ کیونکہ اس کے لئے یہی بہتر سمجھا جاتا ہے کہ وہ دوسروں کی غلطیاں پکڑنے کے بجائے اپنی غلطیوں کی درستی کرے۔

خطا اور غلطی کے اس ادراک کے بعد یہ لازم ہے کہ خطا کاری اور غلط کاری میں فرق سمجھا جائے۔ خطا کاری سہو اور تقصیر (قصور) ہے اور غلط کاری بداعمالی اور بدچلنی ہے۔ خطا کاری انسانی فعل میں کوتاہی کا نتیجہ ہے اور غلط کاری سراسر شیطانی فعل ہے۔ خطا کار بھول چوک میں کچھ کر بیٹھتا

Marfat.com

ہے مگر غلط کار جو کچھ بھی کرتا ہے جان بوجھ کر کرتا ہے۔ اگر انسان کچھ کرنے سے پہلے تھوڑا سا سوچ لے تو غلطی کا امکان کم ہوسکتا ہے اور خطا کاری سے بچ سکتا ہے اور غلط کاری سے باز رہ سکتا ہے۔ اس سے ثابت یہ ہوا کہ خطا کاری سے اگر چہ مفر نہیں مگر اس کی معافی تلافی جیسے تیسے ممکن ہے مگر غلط کاری کے غلط انجام سے بچنے کا واحد علاج غلط کاموں سے باز رہنا ہے۔

یاد رہے کہ غلطی اور توبہ میں واضح فرق یہ ہے کہ غلطی ہو جاتی ہے اور توبہ کی جاتی ہے۔ غلطی میں بھول تو ہوتی ہی ہے مگر توبہ کو بھول جانا بہت بڑی غلطی ہے اور توبہ شکنی سب سے بڑھ کر غلطی ہے۔

غلطی جن وانس اور ملائکہ کی جبلّت ہے اس سے کوئی بھی مبرا نہیں۔ اس کی ابتدا سب سے پہلے ابلیس نے کی (جو اللہ تعالیٰ کے مقرّبین میں سے تھا) اور راندۂ درگاہ کا سزاوار ٹھہرا جبکہ انسانی غلطی کا آغاز حضرت آدمؑ سے ہوا (جس کی تخلیق کا مقصد نیابت الٰہی تھا) جس کی بنا پر انہیں جنت سے نکال کر زمین پر بھیجا گیا اور حضرت حوّاؑ سے دور رکھا گیا۔ دوسری غلطی ان کے بیٹے ہابیل سے ہوئی جس نے اپنے بھائی قابیل کو قتل کر دیا۔ بعدہ غلطیوں کا یہ تسلسل ہمیں اکثر انبیائے کرام کے حالات میں دکھائی دیتا ہے مگر اس سلسلۂ خطا کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کی جانب سے معافی کا بھی ادراک ہوتا ہے اور یہ واضح ہے کہ سہو وخطا کا یہ سلسلہ حیاتِ انسانی کا ایک حصہ ہوتے ہوئے ابدالآباد تک جاری وساری رہے گا اور درِ توبہ بھی برابر کھلا رہے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات بڑی غفور ورحیم ہے۔ خطا پوش وخطا بخش اور توبہ کو قبول کرنے والا ہے۔ ارشاد ربانی بزبانی شاعر ملاحظہ ہو:

ایں درگہہ ما درگہہ نومیدی نیست
صد بار اگر توبہ شکستی باز آ

اب چند خطرناک غلطیاں ملاحظہ کیجئے:

۱) اپنے ماں باپ کی خدمت نہ کرنا اور اولاد سے توقع رکھنا۔
۲) اپنا راز بتا کر اس کے پوشیدہ رکھنے کی درخواست کرنا۔
۳) اس نیت سے عیب/ گناہ کرنا کہ 2/4 مرتبہ کر کے چھوڑ دوں گا۔
۴) بے کاری میں مستقبل کے لئے خیالی پلاؤ پکانا اور خوش رہنا۔

Marfat.com

۵) خودکوسب سے زیادہ عقلمنداورلائق سمجھنا۔

پس ثابت یہ ہوتا ہے کہ اصلاح احوال کی خاطر اگر دفتری، کاروباری یا معاشرتی زندگی میں کسی سے کوئی غلطی سرزد ہوجائے تو اس کا فوری طور پر ازالہ کر لینا چاہیئے اور ازالہ کی ایک ہی آسان صورت ہے کہ اپنی غلطی کو تسلیم کرتے ہوئے معذرت کر لینی چاہیئے اور اگر خدائی اوامر نواہی کے سلسلے میں کوئی بھول ہوجائے یا کوتاہی رہ جائے تو درِ توبہ پر دستک دینی چاہیئے اور ہمیشہ دعا مانگتے رہنا چاہیئے کہ ذاتِ باری تعالیٰ ہم سب کی سہو وخطا سے درگزر فرمائے اور ہمیں جرم وگناہ سے بچنے کی توفیق عطا فرمائے۔آمین۔

Marfat.com

فیشن اور سادگی

فیشن انگریزی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی وضع قطع ،طور طریقے اور مروّجہ آرائش وزیبائش کے ہیں یعنی فیشن موجودہ طرز میں نئے انداز کو رائج کرنے کا نام ہے دوسرے لفظوں میں آپ فیشن کو جدت طرازی کا نام دے سکتے ہیں۔فیشن کا دلداہ فیشن ایبل یا فیشن پرست کہلاتا ہے اور

سادگی کا مطلب صفائی ،صاف دلی ،راست بازی اور بھولا پن ہے اور سادگی پسند سادہ وضع ،سادہ ،سادہ دل ،سادہ لوح اور سادہ مزاج ہوتا ہے۔مختصر یہ کہ سادگی سادہ پن کا نام ہے جس میں بناؤ سنگار اور تصنع کو دخل نہیں ہوتا مگر فیشن سراسر بناوٹ اور نزاکت ہے کیونکہ اس میں نمود ونمائش کا مقصد مخفی ہوتا ہے بلکہ سادگی اس سے مبرا ہوتی ہے۔

تذکیر وتانیث کی حیثیت سے اگر دیکھا جائے تو فیشن کے مقابلے میں بے چاری سادگی کی کیا حیثیت اور قدر ومنزلت ہے؟ مونث اپنی خوبصورت کوششوں اور دعووں کے باوجود مذکر کا مقابلہ نہیں کرسکتی کیونکہ مذکر کو بہر حال فطری طور پر مونث پر تفوق حاصل ہے۔

فیشن پرست اپنے تئیں روشن خیال تصوّر کرتے ہیں اور سادگی پسندوں کو قدامت پرست سمجھتے ہیں مگر ان کی روشن خیالی خام خیالی ہے کیونکہ سادگی میں جو آسانی اور آسودگی ہے وہ فیشن کے تکلفات میں کہاں؟ کیونکہ سادگی بآسانی اپنائی جاسکتی ہے مگر فیشن کے اپنانے میں دِقّت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔بقول شاعر:

اے درد! تکلّف میں ہے تکلیف سراسر
آرام میں وہ ہیں جو تکلّف نہیں کرتے

چونکہ جدت طرازی فیشن کا وصفِ خاص ہے اس لئے فیشن نت نئے سانچوں میں ڈھلتے رہتے ہیں مگر اکثر ایسا بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ فیشن رجعت پسند بھی ہو جاتا ہے اور پرانے ڈھنگ اختیار کر لیتا ہے۔فیشن کی جدت کی طرح قدامت میں بھی جدت اور ترمیم کوئی بُرا اقدام

Marfat.com

نہیں مگر اس میں تصنع ،تکلف اور اسراف کا عمل دخل کسی نوع پسندیدہ نہیں اور پھر سادگی کا جو اپنا حسن ہے وہ فیشن کے بناوٹی حسن میں کہاں؟ سادگی میں ایک گونہ مناسبت اور اعتدال کا پہلو نمایاں ہوتا ہے جبکہ فیشن میں بے اعتدالی اور عدم مناسبت اکثر دیکھنے میں آتی ہے۔ خورد ونوش، بود و باش اور تن پوشی کے فیشن خوراک کو مضر صحت، رہن سہن کو گراں اور پوشاک کو ناموزوں بنا دیتے ہیں اور خوشنمائی کے شوق میں بناؤ سنگار، چہرے اور جسم کو جلدی بیماریوں سے دوچار کر دیتے ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس سے معاشرہ میں بے راہ روی کی راہیں کھلتی ہیں۔

اسلامی معاشرہ میں غیر مسلم معاشرہ کے طرزِ حیات کے طور اطوار بطورِ فیشن اپنانا اپنے تشخص کو مٹانے کے مترادف ہے لہٰذا اپنی روایات واقدار کے تحفظ اور دفاع کے لئے فیشن کے اس سیلاب کو روکنے اور اس کے پھیلاؤ کے تدارک کے لئے ہمیں ضروری اور مناسب اقدامات اٹھانے اور تدابیر بروئے کار لانے کی ضرورت ہے ورنہ ہمیں خطرناک نتائج کا سامنا کرنا پڑے گا۔

میرے نزدیک ممنوعات وممانعات کی طرف رجوع ورغبت کا نام فیشن ہے۔ دیکھئے نا کہ مستورات کی بے پردگی اور بناؤ سنگار سے مٹر گشت کرنا اور غیر محرموں کو دعوتِ نظارہ دینا فیشن نہیں تو اور کیا ہے؟ اسی طرح خواتین کا قبرستان میں جانا منع ہے مگر اکثر مواقع اور تقریبات پر ان کے قبرستانوں میں جمگھٹے میلے کا سا سماں پیدا کرتے ہیں۔

بس میرا تو یہی مشورہ ہے کہ فیشن کو چھوڑیئے کیونکہ یہ ایک ناسور ہے اور غلط روّیہ ہے۔ سادگی کو شعار بنایئے کیونکہ اس میں آسانی اور آسودگی ہے۔ انسان آسودہ حال اور آسودہ خاطر رہتا ہے اور اطمینان وخوشحالی کی دولت پاتا ہے۔

Marfat.com

قِسم اور قَسم

قِسم اور قَسم نسل کے لحاظ سے عربی اور جنس کے لحاظ سے مونث ہیں۔املا میں ان دونوں کے درمیان صرف زیر اور زبر کا فرق ہے مگر معنوں کے لحاظ سے ان کے مابین زمین وآسمان کا فرق ہے۔قسم حلف، سوگند، عہد و پیمان اور انکار کے معنی دیتا ہے جبکہ قِسم نوع، طرح، حِصّہ، جزو، جنس، طور طریق ڈھنگ، طرز اور بانٹ، تقسیم کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

چیزوں کو قِسم وار دیکھا اور پرکھا جاتا ہے اور انہیں مختلف قِسموں میں تقسیم کیا جاتا ہے تا کہ حصّے وار اور جنس وار ان کو جانا اور سمجھا جا سکے اور ان کے ادنیٰ واعلیٰ اور مفید و غیر مفید ہونے کا یقین ہو سکے۔اشیاء کے علاوہ جانداروں کی جانچ پرکھ کے لئے انہیں بھی مختلف النوع اقسام میں منقسم کیا جاتا ہے مثلاً:

جنسی، نسلی، آبی، خاکی، فلکی، طبقاتی، میدانی، صحرائی، نوری، ناری وغیرہ۔اس تقسیم سے ان تمام اقسام کی مخلوقات کے فطری و ذاتی خواص و جواہر اور محاسن و معائب کی تخصیص کا بآسانی پتہ چل جاتا ہے۔ان کی خوبیوں اور خامیوں سے آگاہی ملتی ہے۔ان کی اصلیّت اجاگر ہوتی ہے اور ان کے اچھے بُرے اور مفید و غیر مفید ہونے کا علم ہوتا ہے۔

لیکن جہاں تک قَسم کا تعلق ہے وہ معنویت کے لحاظ سے خاصی اہمیت کی حامل ہے۔عام طور پر قَسم لی جاتی ہے یا پھر اٹھائی جاتی ہے لیکن اکثر اوقات یہ دی بھی جاتی ہے اور دلائی بھی جاتی ہے۔یہ کھائی بھی جاتی ہے اور اتاری بھی جاتی ہے۔یہ ٹوٹ بھی جاتی ہے اور توڑی بھی جاتی ہے مگر جھوٹے اور مکار لوگ قَسم کی بالکل پروا نہیں کرتے کیونکہ ان کے نزدیک قَسم کھانے ہی کے لئے ہوتی ہے البتہ قَسم ہونا یا قَسم ہو جانا الگ بات ہے کیونکہ اس میں ترک وانکار کا مفہوم مضمر ہوتا ہے۔

قَسم کے اس ذکر سے بالخصوص قَسم کھانے کی اہمیت کو واضح کرنا مقصود ہے۔بات بات پر قَسم کھانا اور ہر چیز کی قَسم کھانا ہماری عادتِ ثانیہ ہے اس سے ہمارا مقصد صرف اپنی بات کی تصدیق کرنا یا دوسروں کو اپنی بات کا یقین دلانا ہوتا ہے۔ہم اپنی پیاری سے پیاری چیز یا بڑی سے

Marfat.com

بڑی شخصیّت کی قسم کھا کر اس کی ماہیت کو اجاگر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہم اولاد کے سر پر یا قرآنِ مجید پر ہاتھ رکھ کر یا کسی بڑے بزرگ کا نام لے کر قسم کھانے کے عادی ہیں مگر قسم کے فلسفہ اور منطق سے بالکل نابلد ہیں ہم اس کی قدر و قیمت اور احساس و پاسداری کا خیال نہیں رکھتے۔

آیئے ذرا اس امر پر غور کریں:

قرآنِ مجید میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے کئی قسموں کی قسمیں کھائی ہیں مثلاً زیتون، انجیر، ستاروں وغیرہ کی گویا اللہ تعالیٰ اس چیز کی قسم کھاتا ہے جو ابدی و ازلی ہیں اور تا قیامت قائم رہیں گی۔ وہ مردہ اور فانی چیز کی قسم نہیں کھاتا۔ سورۃ الحجر میں اس نے اپنے پیارے محبوب نبی ﷺ اوّل و آخر کی قسم کھاتے ہوئے کہا "اے محمد ﷺ! تیری جان کی قسم"۔ قسم کی اس قسم میں مشیت ایزدی اور حکمت الٰہی یہی ہے کہ وہ خود جس طرح حیّ قیوم اور زندۂ جاوید ہے، ہمیشہ رہنے والی چیزوں کی اہمیّت و فضیلت کو واضح کرنا ہے اور جب وہ نبی آخر الزّمان کی جان کی قسم کھاتا ہے تو وہ اپنے بندوں کو اس کی حقیقت و اصلیّت بیان فرمانا چاہتا تھا کہ نبی اکرم ﷺ کا وجود ازل ہے پہلے بھی تھا اور ابد کے بعد بھی قائم و دائم ہے۔

قسم کے اس فلسفہ کے ذکر سے میں تو اسی نتیجہ پر پہنچتا ہوں کہ چیزوں میں اگر کسی چیز کی قسم کھانا پڑے تو قرآنِ مجید سے افضل کوئی چیز نہیں اور اگر کسی شخصیّت کی قسم کھانا مقصود ہو تو سنّتِ ربانی کے مطابق حضورِ پرنور کی شخصیّت کے سوا اور کوئی شخصیّت نہیں واحد و یکتا ہستی صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی ذاتِ والا تبار ہے۔ ان تینوں صورتوں میں قسم کی دونوں لازمی شرائط (سب سے پیاری اور سب سے عظیم شئے) یقیناً پوری ہوتی ہیں مگر میرا مشورہ یہ ہے کہ ہر چند قسم کھانے سے پرہیز کیا جائے اور اگر صورتِ حال ناگزیز ہو تو پھر صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے نام پر قسم کھائی جائے تو بہتر ہے _____ اور یہی بہتر ہے۔

Marfat.com

کھیل اور کھلونا

کھیل اور کھلونا ایک دوسرے کے لازم وملزوم ہیں۔ کھلونا کھیلنے کی چیز ہے جو کھیل کھیلنے کے لئے ہوتا ہے اور کوئی کھیل ایسا نہیں جو کھلونے کے بغیر کھیلا جا سکے۔

کھیل اگرچہ کئی ایک معنوں (مشغلہ، شغل، دل بہلاوا، کرتب، تماشا، کام کاج، فعل، دھندا وغیرہ) میں استعمال ہوتا ہے مگر ہم یہاں اسے صرف عمومی مفہوم (بازیچہ) میں ہی استعمال کر رہے ہیں تا کہ لفظوں کے کھلونوں سے ہمارا کھیل بن پائے مگر یاد رہے کہ

" کھیل تماشا" کے مرکب کا مفہوم جدا ہے کیونکہ کھیل کھیلنے سے متعلق ہے اور تماشا دیکھنے اور دکھانے کے لئے ہوتا ہے۔ تماشا میں فن اور کرتبوں کی نمائش ہوتی ہے جو فن کار اور بازیگر وغیرہ لگاتے اور دکھاتے ہیں مثلاً گڑیوں اور پتلیوں کا تماشا، فلم کی نمائش، آتش بازی اور بازی گروں کے کرتب وغیرہ۔ اسی طرح

''کھیل کود'' کا مرکب محض اُچھل کود اور لہو ولعب کے معنی دیتا ہے۔ بچے مٹی، دھات اور پلاسٹک سے بنے طرح طرح کے کھلونوں سے کھیلتے ہیں۔ وہ کھلونے دیکھ کر مچل جاتے ہیں اور کھلونوں کو پا کر بے حد خوش ہوتے ہیں۔ وہ ان سے کھیلتے ہیں اور پھر انہیں توڑ دیتے ہیں مگر وہ نہیں جانتے کہ وہ خود اپنے والدین کے لئے کھلونا ہوتے ہیں مگر حیف ہے ان لوگوں کی عقل پر جو عورت کو ایک کھلونا سمجھتے ہیں اور ان سے جنسی کھیل کھیلتے ہیں۔ اس کھیل میں اغواء اور زیادتی کی وارداتیں بھی شامل ہیں مگر ازدواجی تعلقات میں یہ کھیل جنسی، فطری اور مذہبی لحاظ سے بالکل جائز متصور ہوتا ہے۔

کھیلوں کی کئی اِقسام ہیں اور وہ سینکڑوں کی تعداد میں ہیں۔ انہیں کئی لحاظ سے تقسیم کیا جا سکتا ہے مثلاً سپاہیانہ اور مجاہدانہ۔ دلیرانہ اور بزدلانہ۔ دانشمندانہ اور احمقانہ۔ امیرانہ اور غریبانہ۔ شاہانہ اور آزادانہ۔ صحت مندانہ اور غیر صحت مندانہ۔ جسمانی اور جنسی۔ تعلیمی اور سیاسی علاوہ ازیں بچوں، بڑوں، مردوں اور عورتوں کے کھیل وغیرہ وغیرہ۔

Marfat.com

یوں تو کھیلوں کی اِقسام اور تعداد کی فہرست بڑی طویل ہے مگر ہم انہیں صرف تین حِصّوں میں تقسیم کر کے ان میں سے صرف چند ایک کی نشاندہی پر اکتفا کرتے ہیں:

۱۔ **قدیم کھیلیں:** دوڑ، کشتی، کبڈی، گلی ڈنڈا، کوٹلہ چھپاکی وغیرہ۔

۲۔ **جدید کھیلیں:** کرکٹ، ہاکی کے علاوہ یوگا، جوڈو، کراٹے اور بلیئرڈ وغیرہ۔

۳۔ **رئیسانہ/شاہانہ کھیلیں:** شطرنج، گھڑ دوڑ، پولو، گالف وغیرہ۔

علاوہ ازیں چوتھی کا بھی ایک کھیل ہوتا ہے جو ہندوؤں کے ہاں شادی کے چوتھے دن کھیلا جاتا ہے۔ یہ پھولوں کی قمچیوں (چھڑیوں) سے کھیلا جاتا ہے جس میں دولہا اور سالیاں ایک دوسرے کو پھول اور میوے مارتے ہیں ——— میں اس رسمی کھیل کو اگر ''عروسانہ کھیل'' کا نام دوں تو بے جا نہ ہوگا۔

کھیلوں کی اقسام کے سلسلہ میں ایک دوڑ (ریس) کو ہی لے لیجئے اس کی لاتعداد قسمیں ہیں مثلاً ڈاگ، بُل، گھڑ، کیمل، موٹر سائیکل، کار، ٹرک اور رون ویلنگ ریس۔ ون لیگ، تھری لیگ اور ساکس ریس۔ 100 میٹر سے 1600 میٹر تک کی دوڑ وغیرہ وغیرہ۔

کھیلنا فطری امر ہے مگر کھیلیں انسان کی اپنی پیدا کردہ ہیں۔ ان سے جسم اور اعضاء کی متوازن نشوونما ہوتی ہے اور انسان صحت مند اور تن درست رہتا ہے۔ انسان پیدائش سے لے کر موت تک کسی نہ کسی انداز میں کوئی نہ کوئی کھیل کھیلتا رہتا ہے بالآخر بیماری اور بڑھاپے سے کھیلتے کھیلتے موت سے کھیل کر مات کھا جاتا ہے اور ہار کے احساس سے زیرِ زمین منہ چھپاتا ہے۔

پہلوانی، کشتی اور کبڈی قدیم ترین کھیل ہیں جو زور آزمائی اور جرأت و جوانمردی کے کھیل ہیں۔ مگدر رانی، کلائی پکڑنا اور وزن اٹھانا اور دوڑ بھی اسی قبیل کے کھیل ہیں۔ ڈرل، پی ٹی اور جمناسٹک (جو مختلف اعضاء کی مشقیں ہیں) زمانے کی ترقی کے ساتھ ساتھ جدید سے جدید ترین انداز میں یہاں تک پہنچ گئے ہیں کہ انہیں باقاعدہ ایک فنی اور تدریسی مضمون کی حیثیت سے فزیکل ایجوکیشن (تعلیم جسمانی) کے نام سے شامل نصاب کر لیا گیا ہے۔

مجاہدوں اور دہشت گردوں کے کھیل جداگانہ ہوتے ہیں۔ مجاہد نوبل کاز کے لئے جہادی کھیل کھیلتا ہے جو بلحاظ مقاصد قابلِ داد و تحسین سمجھے جاتے ہیں اور دہشت گرد کے کھیل سراسر تخریب کاری کے زمرہ میں آتے ہیں اور ہمیشہ جان و مال کے اتلاف پر منتج ہوتے ہیں۔ مجاہدوں

Marfat.com

کے کھیل حربی اور برملا ہوتے ہیں جبکہ دہشت گردوں کے کھیل تخریبی اور خفیہ ہوتے ہیں مجاہد جان دے کر شہادت کے مرتبہ پر فائز ہوتے ہیں مگر دہشت گرد دوسروں کی جانوں سے کھیل کر تعزیر و سزا کے مستحق سمجھے جاتے ہیں اور خود اپنی جان بھی گنوا کر خودکشی کے مرتکب ہوتے ہیں۔

چور اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے چوری کے کھیل چوری چھپے کھیلتا ہے اور پکڑے جانے پر سزا کا مستوجب قرار پاتا ہے۔ایک طالب علم بھی چور کی طرح اپنی کامیابی کے لئے چوری چھپے کمرۂ امتحان میں نقل کی کوشش کرتا ہے مگر پکڑے جانے پر اپنا کیریئر تباہ کر بیٹھتا ہے۔ضرورت اس امر کی ہے کہ یہ ہر دو چور دوسروں کی حق تلفی اور اپنے مستقبل کی تباہی سے باز رہیں۔

تاش، شطرنج اور جوا بھی قدیمی کھیل ہیں۔تاش اور چوپڑ بے کاروں اور نکموں کا کھیل ہے جو وقت کٹی یا تضیع وقت کے لئے کھیلا جاتا ہے۔شطرنج امیرانہ اور شاہانہ مشغلہ سمجھ کر کھیلا جاتا ہے اور جوا جواریوں کا کھیل ہے جو ہر شخص کھیل سکتا ہے، کھیلتا ہے اور کھیلنے کی کوشش کرتا ہے۔یہ دراصل شرط کے ساتھ کھیلا جاتا ہے جو تاش، شطرنج اور ریس وغیرہ پر لگائی جاتی ہے پرچی جوا بھی اسی قبیل کا کھیل ہے۔آج کل تو بات بات پر شرط لگانے کی وبا عام ہو چکی ہے یہاں تک کہ بین الاقوامی کھیلوں اور سیاسی انتخابات کے نتائج پر بھی شرطیں لگا کر کھیلا جاتا ہے مگر کمال کی بات یہ ہے کہ پرائز بانڈز اور سرٹیفکیٹس کا جوا حکومتی حمایت و سرپرستی میں بڑا کھل کر کھیلنے کا رواج اتنا عام ہو گیا ہے کہ غریب اپنی قسمت آزمائی اور امیر امیر تر ہونے کی حرص و توقع میں اپنی اپنی استطاعت کے مطابق بلکہ اپنی استطاعت سے بڑھ کر سرمایہ کاری کرتے ہیں۔

کاروباری حضرات بھی سستے داموں مال خرید کر ذخیرہ اندوزی سے زیادہ سے زیادہ منافع خوری کا کھیل کھیلتے ہیں۔دام بڑھ گئے تو پون بارہ دام گر گئے تو سب کچھ چوپٹ۔اگرچہ اس کھیل کو کاروباری کھیل سمجھا جاتا ہے مگر درحقیقت یہ جوا کا ہی کھیل ہے _____ یاد رہے کہ نشہ اور جوا کے تمام کھیل و مشاغل اسلامی تعلیمات کے سراسر خلاف ہیں اور حرام سمجھے جاتے ہیں۔

پتنگ بازی اور کبوتر بازی بھی اگرچہ کھیلوں میں شمار ہوتی ہے جنہیں شوقیہ کھیل سمجھا جاتا ہے مگر پتنگ باز اور کبوتر باز کھیل کھیل ہی میں نہ صرف اپنی جان گنوا بیٹھتے ہیں بلکہ دوسروں کے لئے بھی جان لیوا ثابت ہوتے ہیں۔آج کل ون ویلنگ کا خودکش کھیل رواج پا رہا ہے جس سے ویلرز اپنی زندگی سے کھیل جاتے ہیں۔

Marfat.com

حرب وضرب کے فوجی کھیل اور جانبازی کی مشقیں بھی فوجیوں کے کھیل تو ہیں جو ہمیشہ عصری تقاضوں کے مطابق بدلتے اور فروغ پذیر رہتے ہیں مگر عشق کا کھیل جاں نثاری کا ایسا کھیل ہے جو دل سے کھیلا جاتا ہے مگر اہلِ عقل وشعور اسے دل کا روگ اور درد سمجھتے ہیں اور شعرأ حضرات طبیب بن کر اس کا علاج تجویز کرتے ہوئے یوں کہتے ہیں کہ

دردمند عشق را دارو بجز دیدار نیست

مگر اہلِ عشق اسے مجازی وحقیقی کا نام دے کر اپنا مذہب گردانتے ہیں۔ بہر حال یہ ان کا ذاتی معاملہ ہے جسے وہ بہتر جانتے ہیں ہمیں اس سے کیا سروکار۔

شکار کے کھیل بھی کئی اقسام کے ہیں جو جالوں اور ہتھیاروں سے کھیلے جاتے ہیں۔ کوئی درندوں اور جنگلی جانوروں کا کھیل اپنی جان کی بازی لگا کر کھیلتا ہے۔ کوئی پرندوں اور آبی جانوروں کا شکار انہیں اپنا لقمۂ حلق بنانے کے لئے کھیلتا ہے۔ کوئی مچھلی کا شکار کھیل کر جھک مارتا ہے۔ کوئی سؤر کے بے سود اور لاحاصل شکار کا کھیل کھیلتا ہے۔ بعض کتوں کے شکاری ہرنوں اور خرگوشوں کے شکار میں کتے کھسّی کرتے ہیں مگر عشق کے کھلاڑی عشق کا کھیل محض اپنی جان کو دکھوں اور عذابوں میں ڈالنے کے لئے کرتے ہیں مگر عجب کی بات تو یہ ہے کہ یہ سب شکاری اپنے اپنے کھیلوں کو شوقیہ کھیل قرار دیتے ہیں۔

سیاستدانوں اور شعراء وادباء کے کھیل بڑے نرالے ہوتے ہیں۔ سیاستدانوں کے تمام کھیل ان کے سیاسی حربے ہوتے ہیں جو گرگٹ کے رنگوں جیسے ہوتے ہیں اور نت بدلتے رہتے ہیں مگر شعرأ وادبأ کے سب طرح کے کھیلوں کا دارومدار لفظوں پر ہوتا ہے جنہیں وہ کھلونا بنا کر استعمال کرتے ہیں اور خوب کرتے ہیں ان کے یہ کھیل ان کے ذوقِ آگہی کی دلیل ہوتے ہیں جو ادبی اور اشاعتی شکلوں میں فروغِ علم وادب اور شعور وآگہی کا باعث بھی بنتے ہیں اور یوں معاشرہ کی اصلاح وتعمیر کا فریضہ بھی ادا کرتے ہیں مگر ضرورت اس امر کی ہے کہ ان کے یہ جملہ کھیل منفی اثرات سے بہر نوع پاک ومبرّا ہونے چاہئیں تا کہ معاشرہ تخریب وبے راہروی کا شکار ہونے سے بچا رہے۔ سیاستدانوں اور اہلِ قلم کے کھیلوں میں واضح فرق یہ ہے کہ سیاست دان بیانوں اور وعدوں کے غیر مستقل کھیل کھیلتے ہیں جو بے یقین اور نا قابلِ اعتبار ہوتے ہیں اور اکثر اوقات وہ اپنے کھیل کھیل کر بھول جاتے ہیں نیز وہ تحریری ثبوت نہ ہونے کے باعث قابلِ گرفت بھی نہیں

Marfat.com

ہوتے مگر ادیبوں کے علمی وادبی کھیل تحریری ہونے کے باعث مستقل، دیرپا اور قابلِ تنقید وعمل ہوتے ہیں اس لئے مؤثر ومفید سمجھے جاتے ہیں۔

• حصولِ آزادی اور انقلاب برپا کرنے کے لئے کھیلے جانے والے خون آشام کھیلوں کو اگر چہ جائز وروا سمجھا جاتا ہے مگر ان کا خونیں ہونا کسی نوع گوارا نہیں بھلا ایسے کھیل جن سے انسانی جانیں ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں ضائع ہونے کو کیسے جائز قرار دیا جاسکتا ہے؟ ایسے خونیں کھیلوں کو مزاحمتی اور حربی اقدامات کے بجائے مفاہمتی اور مذاکراتی طریقوں سے کھیلنا بہتر ہے۔

فطرت بھی کھیل کھیلتی ہے اس کے کھیل بڑے سہانے اور خوشگوار ہوتے ہیں جو وقت اور موسموں کے تغیّر وتبدّل سے گوناگوں اور رنگا رنگ ہوتے ہیں مگر اس کے کچھ کھیل ایسے بھی ہوتے ہیں جو بڑے خطرناک اور تباہ کن ہوتے ہیں۔ ان کھیلوں میں بادوباراں کے طوفان، زلزلے اور دیگر ارض وسما کے قدرتی کھیل شامل ہیں۔ دعا ہے کہ خالقِ کائنات اپنے بندوں کو آفت کے ان کھیلوں سے محفوظ ومصئون رکھے اور انہیں توفیق دے کہ وہ ان آفات کو تنبیہ ایزدی سمجھ کر اپنے اعمال کا قبلہ درست کریں۔ آمین

ہم بھی اپنے لڑکپن میں کوڈیوں اور قلموں سے کھیلا کرتے تھے۔ گلّی ڈنڈا کھیلا کرتے تھے۔ گیند سے بچّی اور کِھدّو کھونڈی کھیلا کرتے تھے۔ لُکا چھپی اور کوکلہ چھپا کی کھیلا کرتے تھے۔ دوڑ میں چھوا چھوئی کھیلا کرتے تھے اور تیل کی مالش کر کے ورزش کیا کرتے تھے۔

" کھیل اور کھلونا" کے اس لفظی کھیل تماشے کے اختتام پر میں تو اسی نتیجے پر پہنچا ہوں کہ بس کھیل کھیل ہے اور کھلونا کھلونا ہے اس لئے میرا مشورہ ہے کہ کھیل کو کھیل سمجھ کر کھیلئے مگر زندگی کو کھیل مت سمجھئے۔ زندگی کو کھیل تماشا نہ جانیئے۔ من پسند مگر صحت مند کھیل اپنایئے۔ زندگی کو کھیل کود کی نذر مت کیجئے۔ کھلونوں کو احتیاط سے استعمال کیجئے۔ یہ بڑے نازک ہوتے ہیں انہیں سنبھال کر رکھیے اور کھیلنے کے بعد انہیں مت توڑیئے۔ عورت کو کھلونا مت گردانیئے۔ کسی کے اعتقادات اور جذبات سے کھیلنے سے ہر چند اجتناب برتیئے۔ ہمیشہ ایسے کھیل کھیلئے جو صحت مند، مفید اور ناموری کا باعث ہوں اور ہمیشہ کوشش کیجئے کہ بنا بنایا کھیل کبھی بگڑنے نہ پائے۔

Marfat.com

اپنی بات

باتوں کا سلسلہ روز وشب کی طرح ہر دم رواں دواں رہتا ہے۔ یہ لامتناہی ہے، ہر لمحہ اور ہر قدم پر باتیں پیدا ہوتی ہیں، کہی اور سنی جاتی ہیں۔ دنیا جہان کی چند باتیں کہنے کے بعد اپنی تھوڑی سی بات کہہ کر باتوں کے اس مجموعہ کو ختم کرنا چاہتا ہوں۔ لیجئے سنئے:

نام : میاں مقبول احمد **ولدیت** : میاں محمد اسمٰعیل منظرؒ

تاریخ پیدائش: ا) اصلی: 07-11-1932 ب) کاغذی: 07-11-1933

جائے پیدائش: جگدیو کلاں ضلع امرتسر (بھارت)

رہائش : ا اصلی: کڑیال کلاں ضلع گوجرانوالہ

ب مستقل: "المنظر" گلی میاں مقبول، طیب پارک، شیخوپورہ #+92-56-3783080

تعلیم : ایم۔اے (فارسی، اُردو) بی ایڈ، ایل ایل۔بی

کنبہ : اس وقت میرا کنبہ خود اور جورو کے علاوہ چھ بیٹوں، چھ بہوؤں، گیارہ پوتوں اور گیارہ پوتیوں پر مشتمل ہے۔ دو بیٹیاں ہیں جن میں سے ایک کی ایک بیٹی اور دو بیٹے ہیں جبکہ دوسری بیٹی کے ہاں تا حال کوئی اولاد نہیں۔

قدوقامت: جسم دُبلا پتلا، ہڈیوں کا ڈھانچہ۔ کندھے اُبھرے ہوئے۔ قد چھ فٹ۔ منہ پوپلا۔ گال پچکے ہوئے۔ بتیسی مصنوعی۔ آنکھیں سیاہ مگر عینک سے بے نیاز۔ بال سیاہ وسفید۔ تنفس کے عارضہ کے ساتھ آثار پیری نمایاں۔

خوراک ولباس: خورد ونوش کی تمام اشیاء نعمت خداوندی متصور ہیں۔ خوراک سادہ اور کم۔ دال گوشت اور مٹر قیمہ نسبتاً مرغوب۔ ہر سویٹ ڈش پسندیدہ۔ سب پھل پسند ہیں مگر آم کا زیادہ شوق ہے۔ 1994ء میں سعادت حج کے بعد پینٹ کوٹ ترک کر چکا ہوں اب سنتِ رسول ﷺ کے مطابق سفید وسادہ لباس میں شلوار قمیص کے ساتھ اچکن اور جناح کیپ استعمال کرتا ہوں۔ المختصر جد امجد پیر طریقت اعلیٰ حضرت سائیں مولا شاہؒ نوشاہی قادری کی نسبت سے مزاج اور بود وباش سادہ اور درویشانہ ہے۔

عادات وخصائل: وقت کی پابندی، اصول پرستی اور اقدار وروایات کی پاسداری۔ فکر وسوچ نیک۔ کام سے فطری لگن۔ کام سے کبھی اکتانا تھکتا نہیں۔ "بے کار مباش" ماٹو ہے۔ طبیعت بے حد حساس، زود فہم اور زود رنج ہے۔ حقہ کشی کی لت بلا کی ہے۔ باغبانی اور زراعت سے دلچسپی ہے۔

ملازمت : پیغمبرانہ سنت کے مطابق تدریس کا پیشہ آبائی ہے۔ اَن ٹرینڈ ٹیچر کی حیثیت سے

Marfat.com

ملازمت کا آغاز کیا۔ بی ایڈ کے بعد چھ سال سکول کیڈر میں کام کیا 1964ء میں کالج کیڈر میں آیا اور یوں 36½ سال کی مدت ملازمت کے بعد 60 برس کی عمر میں بحیثیت پرنسپل گورنمنٹ کالج شاہدرہ لاہور، 1993ء میں ریٹائر ہوا۔ آج کل ایک پرائیویٹ کمرشل کالج سے عرصہ پانچ سال سے بطور پرنسپل منسلک ہوں۔

تصنیف وتالیف: تصنیف وتالیف کا مشغلہ 1965ء سے جاری ہے۔ کچھ نہ کچھ لکھتے رہنے کی عادت ہے۔ علمی، ادبی، تحقیقی اور تخلیقی کتب کے علاوہ نرسری سے لے کر بی ایڈ اور ایم اے تک کے مختلف مضامین کی درسی اور ہمدرسی انگریزی اور اُردو میں کتب کی تعداد کئی کئی ایڈیشنوں کے ساتھ ان گنت ہے۔

تصنیفات

اُردو انشائیے:

☆ باتوں باتوں میں ☆ باتوں میں باتیں ☆ بات سے باتیں ☆ باتیں ہی باتیں (زیر تکمیل)

شرح: ☆ شرح دیوان حافظ شیرازی

تدوین:

☆ مقبول عملیات ☆ اُردو نعت نمبر ''مجلہ اوج'' (دو جلد) ☆ ندائے منظر ☆ اُردو لغت (زیر تکمیل)

گرامر:

☆ عاطف اُردو گرامر (دوم تا پنجم) ☆ ریحان اردو گرامر (دوم تا پنجم)
☆ ریحان انگلش گرامر (دوم تا پنجم) ☆ اُردو قواعد و انشاء (دوم تا پنجم)
☆ اُردو سُپر گولڈن سیریز (ششم تا دہم) ☆ انگلش گرامر گولڈن سیریز (ہشتم تا دہم)
☆ اُردو گرامر برائے ایف۔اے (تسہیل القواعد، مرقع گرامر، تکمیل ادب، شاہراہِ ادب (دو دو ایڈیشن مع ترامیم)

درسی:

☆ اُردو قاعدہ (نرسری تا پنجم) ☆ انگلش گرامر (نرسری تا پنجم) ☆ پکچر بک (انگلش) نرسری
☆ پکچرڈ کشنری، انگلش ☆ انگلش جنرل نالج (اوّل تا پنجم) ☆ اُردو جنرل نالج (اوّل تا پنجم)
☆ معاشرتی علوم (اوّل تا پنجم) ☆ مطالعہ پاکستان (ششم تا ہشتم) ☆ گنتی اُردو (اوّل تا سوم)
☆ گنتی انگلش (اوّل تا پنجم) ☆ لکھائی انگلش (اوّل تا پنجم) ☆ لکھائی اُردو (اوّل تا پنجم)
☆ دینیات/اسلامیات (اوّل تا پنجم) ☆ برائے بی ایڈ (تنظیم مدرسہ، تدریس اُردو)
☆ برائے ایم۔اے (افسانوی نثر اور ڈرامہ۔ اسالیب نثر۔ اُردو لسانیات۔ اُردو ادب بیسویں صدی میں۔ اُردو شاعری کلاسیکی عہد میں۔ ساختیات اور پس ساختیات۔ اصول تنقید)

Marfat.com

ہمدردی/امدادی کتب:

☆ اُردو ورک بک (نرسری تا ہشتم) کئی کئی ایڈیشن مع ترامیم
☆ انگلش ورک بک (نرسری تا پنجم) ☆ ماڈل پیپرز (ہشتم و دہم)
☆ گائیڈز (ہشتم، دہم، بی ایڈ) ☆ حل پرچہ جات برائے ایم۔اے (سیاسیات)

ایوارڈز

☆ دوسری پاکستان بوائے سکاؤٹس جمبوری، ڈھاکہ 1958ء
☆ آٹھویں پاکستان بوائے سکاؤٹس جمبوری، کوئٹہ 1981ء
☆ ایجوکیشنل ایوارڈ 6ویں کانووکیشن گورنمنٹ اسلامیہ کالج آف کامرس، لاہور 1990ء
☆ حسن کارکردگی، ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشن 1991-92ء
☆ مولا شاہ ایوارڈ، سائیں مولا شاہ ویلفیئر سوسائٹی (برائے سماجی خدمات) 1992ء
☆ حسن کارکردگی، ڈائریکٹر ایجوکیشن کالجز 1993ء
☆ حسن کارکردگی، پنجاب ریڈ کراس سوسائٹی 1993ء
☆ صدارتی حسن کارکردگی ایوارڈ برائے نعت نمبر (دو جلد) ''مجلہ اوج'' 1993ء
☆ بزم حسان حسن کارکردگی ایوارڈ برائے نعت نمبر (دو جلد) ''مجلہ اوج'' 1993ء
☆ روزنامہ جنگ، کارکردگی ایوارڈ برائے نعت نمبر (دو جلد) ''مجلہ اوج'' 1994ء
☆ شاخ ادب (انصاری فاؤنڈیشن) برائے نعت نمبر (دو جلد) ''مجلہ اوج'' 1994ء
☆ ایجوکیشنل ایوارڈ یوسف آئیڈیل کیڈٹ سکول 1996ء
☆ آکسفورڈ انٹرنیشنل کالج بیسٹ ایڈمنسٹریٹر ایوارڈ 2004ء تا 2008ء

---***---

اختتام

Marfat.com

بزم کی کتابیں

نمبر شمار	ناں کتاب	لکھاری/سودھن ہار	اشاعتی نمبر	چھپن ورہا
1)	سسی مولا شاہ	میاں ظفر مقبول	ISBN-969-8082-09-3	1980
2)	چوہلاں	(انشائیے) میاں ظفر مقبول	ISBN-969-8082-08-5	1985
3)	ٹونباں	(مجموعہ کلام) میاں ظفر مقبول	ISBN-969-8082-07-7	1988-95
4)	لشکیں لشکیں آ گیا	(کافیاں مولا شاہؒ) میاں ظفر مقبول	ISBN-969-8082-06-9	1987-95
5)	نوائے منظر	(مجموعہ کلام) میاں محمد اسمٰعیل منظرؔ/میاں ظفر مقبول	ISBN-969-8082-05-0	1988-90-96
6)	گفت گفتار	(سی حرفیاں سائیں مولا شاہؒ) میاں ظفر مقبول	ISBN-969-8082-04-2	1988-95
7)	پھر گئیاں رُتاں	(بارہ ماہے سائیں مولا شاہؒ) میاں ظفر مقبول	ISBN-969-8082-03-4	1988-96
8)	تحفہ حجاز دا	تنویر بخاری میاں ظفر مقبول	ISBN-969-8082-02-6	1990
9)	باتوں باتوں میں	(اُردو انشائیہ) پروفیسر میاں مقبول احمد	ISBN-969-8082-01-8	1990
10)	باتوں میں باتیں	(اُردو انشائیہ) پروفیسر میاں مقبول احمد	ISBN-969-8082-00-X	1991
11)	سائیں مولا شاہؒ دا قصہ بگا تل بشنو	میاں ظفر مقبول	ISBN-969-8082-10-7	1992
12)	بول حیدری	(سائیں حیدر شاہؒ دی حیاتی تے شاعری) میاں ظفر مقبول	ISBN-969-8082-12-7	1993
13)	النبی الکریم ﷺ	(سیرت ایوارڈ یافتہ) میاں ظفر مقبول	ISBN-969-8082-15-8	1999
14)	نام عالی تیرا ﷺ	(نعتاں) میاں ظفر مقبول	ISBN-969-8082-17-4	2000-01
15)	میں وچ میں	(کافیاں۔محمد شریف) میاں ظفر مقبول	ISBN-969-8082-14-X	2002
15)	شجرہ نوشاہیاں مع باراں امام	سائیں عبدالعزیز	ISBN-969-8082-20-4	2003
17)	مرزا صاحباں (ص۔336)	(ایوارڈ یافتہ) سائیں مولا شاہؒ میاں ظفر مقبول	ISBN-969-8082-21-2	2004
18)	ست گنج آرسی نامہ مولا شاہ عرف زہرہ مشتری	(اردو ترجمہ) سائیں مولا شاہؒ ڈاکٹر میاں ظفر مقبول	ISBN-969-8082-23-9	2007
19)	مرزا صاحباں (ص۔448)	(اردو ترجمہ) سائیں مولا شاہؒ/ڈاکٹر میاں ظفر مقبول	ISBN-978-969-8082-26-0	2007
20)	سسی پنوں	(اُردو ترجمہ) سائیں مولا شاہؒ/ڈاکٹر میاں ظفر مقبول	ISBN-978-969-8082-22-0	2008
21)	بگا تل بشنوں	(اُردو ترجمہ) سائیں مولا شاہؒ/ڈاکٹر میاں ظفر مقبول	ISBN-978-969-8082-28-4	2008
22)	بات سے باتیں	پروفیسر میاں مقبول احمد	ISBN-978-969-8082-25-0	2008
23)	مکاشفہ	(غزلاں) تنویر بخاری	ISBN-978-969-8082-29-1	2008
24)	وساں	(نظماں، غزلاں) ڈاکٹر عظمت اللہ عظمت	ISBN-978-969-8082-27-7	2008
25)	ہیر ورانجھا	(اردو ترجمہ) سائیں مولا شاہؒ/ڈاکٹر میاں ظفر مقبول	ISBN-978-969-8082-30-7	2009
26)	شیخوپورہ تے ننکانہ صاحب دا پنجابی ادب	ڈاکٹر میاں ظفر مقبول	ISBN-969-8082-16-6	—
27)	امرتسری لکھیار	ڈاکٹر میاں ظفر مقبول	—	—

Marfat.com

Marfat.com

ISBN-978-969-8082-25-0

Marfat.com